قومی زبان

گوئم بتو حرفے کہ نداند ہمہ کس

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ۔ کراچی

ماہنامہ
قومی زبان
کراچی

اپریل ۱۹۸۹ء
جلد ۶۱
شمارہ ۴

مضمون نما

ادارِیہ		۳
اقبال اور تماشائے نیرنگِ صورت	ڈاکٹر حنیف فوق	۵
اسرارِ خودی کا ایک فراموش شدہ ایڈیشن	شائستہ خاں	۱۰
فکرِ اقبال کا آفاقی پہلو	عبداللہ شاہ ہاشمی	۲۳
غزل نما		
ظہیر الدین ظہیر دہلوی	ادا جعفری	۲۷
دو خط	ڈاکٹر داؤد رہبر	۳۳
کیسری کشور	ڈاکٹر نیر مسعود	۳۷
اردو کا پہلا ناول	محمد علی صدیقی	۴۶
کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ	ڈاکٹر انور سدید	۵۱
عربی ضرب الامثال	ڈاکٹر منیر الدین احمد	۵۷
اردو، انگریزی سرزمین میں	ساجد منصور قیصرانی	۶۱
گلہائے رنگ رنگ		
بلوچی شاعری کے مطالعے کی نوعیت	پروفیسر عبدالخالق بلوچ	۶۳
عجیب انسان (گجراتی کہانی)	دلو دبھٹ / شاہین فاطمہ	۶۶
نظمیں — شاہ لطیفؒ، خواجہ غلام فریدؒ، نذیر قیصر		۶۹
اصحابِ کہف (عربی کہانی)	فردوس سیار / قطب اللہ	۷۳
رفتارِ ادب		۷۶
گرد و پیش		۸۱
حروفِ تازہ		۸۶
نئے خزانے	ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری	۸۸

ادارۂ تحریر
جمیل الدین عالی
ادا جعفری
ڈاکٹر اسلم فرخی

مدیر معاون
ادیب سہیل

بدلِ اشتراک
فی پرچہ .... ۵ روپے
سالانہ .... ۵۰ روپے
سالانہ (رجسٹری سے) .... ۱۰۰ روپے

بیرونِ ملک
فی پرچہ .... ایک ڈالر
سالانہ .... دس ڈالر
سالانہ (رجسٹری سے) .... پندرہ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱ فون: ۷۲۳۰۲۳۰

بحمد اللہ آج اردو زبان دنیا کے بیشتر ممالک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ برّصغیر سے تعلق رکھنے والے بے شمار افراد دنیا کے دوسرے ممالک میں شاد و آباد ہیں اور زبان و ادب کا پرچم بلند کیے ہوئے ہیں۔ مشرق وسطیٰ، یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا میں بے شمار ادبی انجمنیں اور تنظیمیں بھی قائم ہیں۔ ان تنظیموں کے تحت اور انفرادی طور پر اردو میں اخبارات و رسائل بھی شائع ہو رہے ہیں۔

انجمن ترقی اردو پاکستان بہت عرصے سے کوشاں ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں قائم شدہ اردو زبان و ادب کی تنظیموں سے رابطہ قائم ہو۔ اور اردو میں شائع ہونے والے تمام اخبارات و رسائل کا ایک جائزہ مرتّب کیا جائے تاکہ باہمی رابطہ قائم ہو سکے۔ اور مشترک مفادات کے بارے میں مشترک لائحہ عمل مرتّب ہو سکے۔ یہ کام بڑا اہم اور فوری ضرورت کا ہے۔ ہم "قومی زبان" کے تمام قارئین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے طور پر ان تمام تنظیموں اور اخبارات و رسائل کی نشان دہی کر دیں جن کے بارے میں انھیں علم ہو۔ غیر ملکوں میں آباد اردو بولنے والوں سے بھی ہماری درخواست ہے کہ وہ اپنی تنظیموں اور اردو میں شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کی تفصیل انجمن کو ارسال فرمائیں اور اگر ممکن ہو تو اخبارات و رسائل کا ایک ایک شمارہ بھی ریکارڈ کے لیے بھجوا دیں۔

جن ادبی تنظیموں اور انجمنوں سے ہمارا رابطہ قائم ہو جائے گا۔ ہم "قومی زبان" میں ان کی سرگرمیوں کی روداد شائع کرتے رہیں گے۔ اس طرح ربط باہم اور قربت کی ایک فضا پروان چڑھے گی، تبادلۂ خیالات ہوگا اور ذہنی تفہیم کا بہتر ماحول میسّر آئے گا۔

پرچہ پریس میں تیار تھا کہ جناب مجتبیٰ حسین کے انتقال کی اندوہناک خبر موصول ہوئی۔ مجتبیٰ حسین صاحب جمہوریت پسند مصنّفین لاہور میں شرکت کے بعد کراچی کے لیے روانہ ہو رہے تھے کہ لاہور چھاؤنی میں ان کی کار ایک بس سے ٹکرا گئی اور اس حادثے میں مجتبیٰ حسین صاحب جاں بحق ہو گئے۔ ٹریفک کے خونی حادثے روزمرّہ کا معمول بنتے جا رہے ہیں اور روزانہ نہ جانے کتنے معصوم شہری ان حادثوں کے بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین صاحب اردو تنقید کا ایک مستند اور معتبر حوالہ تھے۔ ان کی تحریروں اور ان کے علم سے بے شمار علم دوستوں اور طالب علموں نے فائدہ اٹھایا۔ وہ اپنی تنقیدی تحریروں کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

ڈاکٹر حنیف فوق

اقبال اور تماشائے نیرنگِ صورت

اقبال کو اس دورِ سیاست آرائی نے اس طرح اپنی کش مکش کا آئینہ بنا لیا ہے کہ ان کی شاعرانہ حیثیت پسِ پشت پڑ گئی ہے۔ جہاں ایک جانب انھیں اُونچے ستون پہ نصب کر کے ان کی پرستش چاہی جا رہی ہے، وہاں دوسری جانب ان کی ٹانگیں گھسیٹ کر منہ کے بل گرانے کی کوشش بھی جاری ہے۔ ان مختلف نقطہ ہائے نظر میں اقبال کی فکر و شاعری کم اور ان کے پردے میں دوسرے عناصر کی پیکار و آویزش زیادہ ہے۔ مثلاً ایک گروہ ان کی شاعری کے سارے حقوق اسلام اور مسلمانوں کے لیے محفوظ سمجھتا ہے تو دوسرا انھیں صرف پاکستان کے واسطے سے جانتا ہے۔ پھر کہیں سے آواز اٹھتی ہے کہ ان کا تصورِ پاکستان تو دراصل توسیع طلبی کی صدائے بازگشت ہے، جہاں انھیں اردو شاعری کا عرفِ آخر سمجھا جا رہا ہے۔ وہاں بعض گوشوں میں ان کی شاعرانہ صلاحیت ہی مشکوک ٹھیرتی ہے۔ حال ہی میں جب ہمسایہ ملک میں غالب کا صد سالہ یادگار جشن منانے کے لیے بڑے اہتمام و احتشام کا مظاہرہ کیا گیا تو بعض حلقوں کو یہ خیال ہونے لگا کہ دراصل یہ اقبال کی عظمت کم کرنے کی منظم سازش ہے۔ دوسری طرف یومِ پاکستان کے سلسلے میں بعض ایسے مقالے اخبارات میں شائع ہوئے جن میں تجویزِ پاکستان کے حوالے سے اقبال کو ایک خطّے کا "کچھ معروف" شاعر قرار دیا گیا اور بس۔ جب اقبال دوستی اور اقبال دشمنی دونوں میں اقبال سے زیادہ مختلف عصبیتوں کا ہاتھ نظر آنے لگے تو دل کو رونے اور جگر کو پیٹنے کے سوا کیا چارہ رہ جاتا ہے۔

اقبال کے سلسلے میں سب سے بڑا مغالطہ ان حامیانِ اقبال کا پیدا کردہ ہے جو اقبال کے تخلیقی جوہر کو نظر انداز کر کے محض اس کی حکمت اور فکر کے قائل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال کی فکر شاعرانہ نے اپنے دور کی سیاست اور فلسفہ کے مختلف رنگوں سے اپنے خیالی پیکر سنوارے ہیں لیکن ان کا طریقِ فکر فلسفیانہ منطق سے زیادہ شاعرانہ جذبہ سے سروکار رکھتا ہے۔ اور جس سے ان کی شاعری نے آب و رنگ پایا ہے، اس میں شاعرانہ احساس کی تابانی حل ہوئی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس فکرِ شاعرانہ کو منطق کے ترازو میں تولا نہیں جا سکتا۔ اس فکر کا جائزہ سماجی اور سائنسی علوم کی روشنی میں بھی لیا جا سکتا ہے اور لیا جانا چاہیے لیکن اسے بہرحال یاد رکھنا چاہیے کہ اقبال کی فکر کے وسیع اثرات میں ان کے شاعرانہ تجربہ کی گہرائیاں شامل ہیں۔ اگر اپنے افکار کی تعمیر میں اقبال نے شاعرانہ تجربے کا لہو نہ نچوڑا ہوتا تو اس عمارت میں یہ رنگینی اور شکوہ نہ آتا۔ جہاں اقبال نے شاعرانہ ژرف اثر آفرینی سے کام لیا ہے، وہاں تو شاعری کی طلسمی کاریگری صاف ظاہر ہے لیکن ان مقامات پر بھی جہاں وہ نسبتاً آسانی سے گزر گئے ہیں

یہ احساس ہوتا ہے کہ تجربے کو شاعرانہ اظہار کی سطح تک آتے آتے کتنے ہی سوز و ساز کے مراحل طے کرنا پڑے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ ان کے یہاں فلسفہ، فلسفہ نہیں رہا ہے، واردات بن گیا ہے۔ وہ مسجدِ قرطبہ کا اسی جوش و جذبے سے تذکرہ کرتے ہیں جس طرح کوئی حسنِ محبوب کے اوصاف بیان کرتا ہے۔ ان امور کے پیشِ نظر وہ بنیادی طور پر شاعر ٹھیرتے ہیں لیکن ایسا شاعر جس کے فنی مقاصد محض تخلیقِ فن سے مطمئن نہیں ہوتے اور جو اپنی آواز کی تعمیر میں دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ خارج کے پُرشور ہنگاموں سے بھی مدد لیتا ہے۔

اقبال کی شاعری میں فکر کی جو دعوت ملتی ہے اس میں ان کے مجموعی شعور کو بہت کچھ دخل ہے۔ اس لیے ان کے پیغام کا تجزیہ کرتے ہوئے جہاں ان کی بنیادی شاعرانہ خصوصیتوں سے بحث کی جا سکتی ہے، وہاں ان خصوصیتوں نے جن عصری اور فکری رجحانات کو فروغ دیا ہے۔ ان کی معنویت، وسعت اور صداقت کا وسیع تر علمی پس منظر میں جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ جائزہ اگر ان کی شاعری کے بنیادی جوہر یعنی خلاقانہ فکر کو نظر انداز کر دیتا ہے تو اسے منصفانہ کہنا مشکل ہے۔ یہ فکر شاعرانہ احساس کے نیرنگِ صورت میں ڈھلی ہے۔ کیوں کہ اقبال کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت یہی ہے کہ ان کے مجموعی شعور نے جس میں مذہب، سیاست، فلسفہ، تبلیغ، قومیت، بین الاقوامیت، وطن دوستی، اتحادِ اسلامی، تقلید، اجتہاد، روایت، بغاوت، مشرقیت، مغربیت، اشتراکیت دوستی، جمہوریت اور مخالفِ جمہوریت وغیرہ کے مختلف بلکہ بعض اوقات متضاد عناصر ملتے ہیں جو سانچے وضع کرنا چاہتے ہیں، پہلے انھیں شاعرانہ تجربے کی بھٹی میں پگھلایا ہے۔ اس لیے جس خیال کو وہ اپنی گرفت میں لیتے ہیں، اس میں زندگی کی آنچ دوڑا دیتے ہیں۔ یہ کام نرے فلسفی کے بس کا نہیں، اس کے لیے شاعرانہ بصیرت کی ضرورت ہے اور یہ بصیرت ہمیں اقبال کے کلام میں وافر ملتی ہے۔

بڑی شاعری تنگ دائرے سے باہر آنے کا نام ہے۔ خواہ یہ دائرے ذات کے بنائے ہوئے ہوں یا ملت اور قومیت کے قایم کردہ۔ اقبال جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت" کس حد تک ان تنگ دائروں کو توڑنے میں کامیاب ہوئے ہیں؟ کیا ان کی شاعری میں غالب کی سی وسیع النظر آفاقیت ملتی ہے یا وہ ظفر علی خاں کی طرح محض ہنگامی حادثات کے شاعر کہے جا سکتے ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ غالب کی سی وسیع تر آفاقیت اقبال کے یہاں ملتی ہے تو اس پہ کسی نہ کسی حد تک اسلام کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ لیکن ان کی بڑائی یہ ہے کہ وہ عذابِ دانشِ حاضر سے پوری طرح باخبر ہیں اور یہ باخبری صرف خبر کی حد تک نہیں بلکہ اس عذاب میں وہ اپنے آپ کو مثلِ خلیل مبتلا پاتے ہیں۔ چناں چہ ان کی شاعری میں جس طرح اس عذاب کو لفظوں میں سر بہ مہر کر کے پیش کیا گیا ہے، اس کی وجہ سے وہ محض مسلمانوں کی نئی سیاسی بیداری کے شاعر نہیں رہتے بلکہ اس وسیع عالمِ انسانیت کے شاعر بن جاتے ہیں جو مشینوں کے دھوئیں سے سیہ پوش فضا میں اپنی شخصی انفرادیت اور اجتماعی وجود کا اثبات ڈھونڈ رہی ہے۔ ان کی شاعرانہ نگاہ کبھی عقل کی توجیہوں کو تلاش کرتی ہے اور کبھی عقل سے آگے وجدان کی راہوں میں عشق کے چراغ روشن کرتی ہے۔ یہ تضاد آفرینی زندگی کی خصوصیت ہے اور اقبال نے بعض اوقات تضادات کو نئی ترکیبی صورت عطا کرنے کے بجائے بجنسہٖ پیش کر دیا ہے۔ وہ کبھی شعور کی مدد سے نزدیک و دور کا جائزہ لیتے ہیں بلکہ کبھی معراج کو شعور کے انقلاب سے تعبیر کرتے ہیں، اور کبھی عشق کی تیغِ جگر دار کے مقابلے میں علم کے ہاتھ میں خالی نیام دیکھتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس علم کے جسے انھوں نے

" اعتبارِ آدم " قرار دیا ہے، قائل نہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

علم، حرف و صوت را شہپر دہد ۔۔۔ پاکیٔ گوہر بہ ناگوہر دہد

علم را بر اوجِ افلاک است رہ ۔۔۔ تا ز چشمِ مہر بر کند د نگہ

لیکن علم اور عشق کے تضاد کو وہ کوئی نئی ترکیبی صورت دینے کے بجائے بڑی حد تک حکیمانہ اور متصوفانہ انداز پیش کر دیتے ہیں۔ ان کا یہ نظریہ کہ " بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم "، تصوف کے پھیلے ہوئے سلسلوں سے استحکام حاصل کرتا ہے۔ خود علم کے بارے میں ان کے تصورات پر حکمائے اسلام کا اثر نظر آتا ہے، جس کے تحت بیدل نے لکھا تھا ؎

چیست علم؟ اصلِ قدرتِ بے چوں ۔۔۔ نظمِ جمعیتِ ظہور و بطوں

حسنِ مرآتِ عالم و معلوم ۔۔۔ نورِ تمیزِ حاکم و محکوم

نزدِ اہلِ حقیقت و ایجاد ۔۔۔ ہیچ چیزے بغیرِ علم نزاد

ہر چہ بینی ز مفرد و ترکیب ۔۔۔ دارد از علم جوہر ترتیب

اقبال کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس تضاد کو اپنے دور کی صداقتوں کے پس منظر میں پیش کیا، اور اس سلسلے میں جہاں مشرق کے دبستانوں کو کھنگالا وہاں مغرب کے گلستانوں سے بھی خوشبوؤں کے کارواں سمیٹے۔ اس لیے ان کا یہ دعویٰ غلط نہیں کہ ؎

خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ ۔۔۔ سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

البتہ اس دعوے میں " صحبتِ صاحب نظراں " پر جو زور ملتا ہے وہ ہمیں اقبال کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے اس لیے دماغ کے مقابلے میں دل کے اور حکیمانِ فرنگ سے زیادہ صاحب نظراں کے قائل نظر آتے ہیں۔ اقبال کے اس نقطۂ نظر کی منطقی توجیہات تو بے شمار کی گئی ہیں لیکن یہ ایک سیدھی سی حقیقت ہے کہ وہ شاعر ہونے کے واسطے سے حواس پر طاری ہو جانے والی کیفیتوں کو عزیز تر رکھتے تھے اور تصوراتی صداقتیں بھی انھیں اسی وقت اپیل کرتی تھیں جب وہ ان کے حواس کا جزو بن جاتی تھیں۔ بہ قول مولانا روم ؎

نطقِ آب و نطقِ باد و نطقِ گِل ۔۔۔ ہست محسوسِ حواسِ اہلِ دل

حکمتِ اشیا کو وہ فرنگی نژاد نہ سمجھتے ہوئے اس کا اصل لذتِ ایجاد کو قرار دیتے تھے۔ لیکن جہاں عشق و حکمت میں ٹھن جاتی تھی (وہاں عقلی دلائل جو بھی ہوں) ان کا دل عشق ہی کی جانب رجوع ہو جاتا تھا۔ اگرچہ وہ عشق کے جذب و کشش کے نظام کو وسیع ترین فلسفیانہ مفہوم عطا کر دیتے ہیں۔ لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ میر سے لے کر اقبال تک جذبۂ عشق جو سلسلۂ ظہور سے دامن باندھے ہوئے ہے اپنی گوناگوں کیفیتوں کے اعتبار سے تجرباتی صداقت ہی کی سطح سے بلند ہو کر آفاقی بلکہ کائناتی حقیقت بنا ہے۔ اقبال علم و عقل کے بھی قائل ہیں لیکن ان کا دل عشق کے لیے دھڑکتا ہے۔

اقبال کی شاعری میں جن مختلف النوع رجحانات کا پتا چلتا ہے وہ اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ اس وسیع دنیا میں خوابوں اور حقیقتوں کی کشمکش میں وہ ایک جانبدار فریق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ احترامِ آدمیت کی لے بلند کر کے

انسان کو خدا کا حلیف بنا دیتے ہیں۔ اقبال اپنی فکری توانائی سے کام لے کر اس جہان کو صنم خانۂ پندار بنانے کے درپے ہیں۔ یہ پندار شاعر کی ذات سے زیادہ عالمِ انسانیت کا پندار ہے۔ وہ شررِ تیشہ سے خانۂ فرہاد روشن کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس سے بھی آگے تسخیرِ فطرت کا پرچم بلند کرتے ہوئے زندگی کی تاریک رات کو انسانی کوشش کے چراغ سے روشن رکھنے کے مدّعی ہیں۔ وہ زندگی کے تضادات پر نظر رکھتے ہیں لیکن زندگی کی خیر و برکت کی طاقتوں کو فتح مند دیکھنے کے لیے انسانی عظمت کے جذباتی دل سوزی سے بھرپور نغمے گاتے ہیں۔ ان نغموں میں فطرت اور کائنات کے حسن کی جھلک بھی ملتی ہے لیکن ان کا مرکزی تصوّر عروجِ آدم ہے۔ اقبال نے اسلامی تاریخ و تہذیب، روایات و اساطیر اور تخیّلات و تصوّرات سے فائدہ ضرور اٹھایا ہے لیکن جس طور پر انھوں نے ان عناصر کی تعبیر کی ہے، اس نے فکر کی تشکیلِ جدید کا ساز چھیڑا ہے۔ ان کی مذہبیت، ملائیت اور منافقت دونوں سے بری ہے۔ وہ اپنے دور کے تاریخی شعور سے کام لیتے ہوئے اپنی فکر کو نئی بنیادوں پر استوار کرتے ہیں۔ ان کی فکر ایک متحرّک قوت ہے جس نے زندگی میں حرکت کے تصوّر کو اہمیت دینے کے ساتھ ساتھ خود ایک متحرّک کائنات کے مثبت نظریہ سے روشنی پائی ہے۔ مشرق و مغرب کے زرخیز ترین دماغوں کی بہترین کاوشیں اقبال کی خلّاقانہ فکر کی بدولت عصری نقوش کو روشن کر کے روشنی کا دائرہ بناتی ہیں اور یہی روشنی کا دائرہ اقبال کی شاعری ہے۔ یہاں اقبال کے لیے عشق بھی خرد افروزی کا حامل بن جاتا ہے۔

اقبال نے خدا اور انسان کی شرکت سے جس کائنات کو ترتیب دینا چاہا ہے، اس کی تازگی آج بھی نئی نسل کو سامانِ سرخوشی فراہم کرتی ہے۔ ان کے شاعرانہ افکار کے ترتیبی ڈھانچے میں پھپھوندی لگ سکتی ہے۔ لیکن اس کے پسِ پشت جو تخلیقی توانائی، خیال کی تابانی، جذبے کی گرمی اور خوابوں کی روشنی ملتی ہے وہ ان کی شاعری کو انسانی آرزومندی کی نہ مٹنے والی داستان بنا دیتی ہے۔ وہ انسان کو اپنے گرد و پیش اور کائنات کی گہری آرزوؤں میں شریک ہو کر خود اپنے اور کائنات کے مقدّر کی تشکیل کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں، اور انسان کی طرف سے کیے ہوئے اقدام کو سراہتے ہوئے اس کے عزم کو "خلّاقِ تقدیرِ حق" قرار دیتے ہیں۔ ان کے بعض نظریات سے اختلاف کرتے ہوئے بھی ان کی شاعری کی مسحور کن کیفیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس میں جو خواب اور بیداری کے ملے جلے رنگوں کی چھوٹ پڑتی ہے، اس کی دلکشی اور حسن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اقبال کے اندر کے انسان میں جو چاہت، خلش اور اضطراب کی کارفرمائی ملتی ہے اس کو ان کے فوق الانسان کا تصوّر بھی ایک جابرانہ تنظیم میں ڈھالنے سے قاصر رہا ہے، اور یہی ان کی شاعری کی ان کے نظریے پر فتح کی دلیل ہے۔ انسان جس کی نگاہ سے تقدیریں بدل جاتی ہیں، عالمِ جوشِ جنون میں سب کچھ روا رکھنے کی اجازت چاہتا ہے۔ یہ مردِ مومن اور جنونِ آرزو ایک ہی حقیقت کے دو مختلف روپ ہیں اور اسی میں اقبال کی خون کی گردش تیز کر دینے والی شاعری کی کامیابی کا راز پنہاں ہے۔ یہ مقدّس بے اطمینانی جس کی جھلک ان کی شاعری میں کئی جگہ ملتی ہے، اسے ہنگامی سطح سے بلند کرتی اور انسانیت کے نقوش سنوارتی ہے۔

اقبال نے قومی بیداری کو ایشیا کی سیاسی بیداری کا جزو بنا دیا ہے۔ پاکستان کی تجویز سے زیادہ یہ بات اہم ہے کہ اقبال نے اس ذہنی سفر کے لیے ہمیں تیار کیا جو اس برصغیر کی آزادی، دو مملکتوں کے قیام اور معاشی انصاف کی جدوجہد پر مبنی ہے۔ ان کی شاعری کی جذباتی اپیل اپنے فکری پس منظر کی وجہ سے محض جذباتیت کی سطح پر نہیں رہی،

بلکہ اجتماعی حرکت وحرارت کا نشان بن گئی۔

اقبال نے قائداعظم کے نام اپنے خطوط (۱۹۳۷ء) میں ملک کی تقسیم اور قطعی اکثریت کے مسلم صوبوں کے علیٰحدہ فیڈریشن کی تجویز پیش کرتے ہوئے شمالی مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو قومیت اور حقِ خودارادیت کا حامل جانا تھا۔ یہی بات کہ اقبال نے اس مملکتِ تازہ کے تصوّر میں اوّل اوّل صرف اس برصغیر کے مغربی حصے کو پیشِ نظر رکھا تھا، ان کی سیاسی کوتاہ نظری کی دلیل بھی ہوسکتی ہے اور ان کی دوررس نظر کی گواہی بھی دے سکتی ہے۔ تاریخ ہی اس فیصلے کی مجاز ہے۔

علاّمہ اقبال کی شخصیت اور فن پر لکھی جانے والی پہلی کتاب

اقبال

مصنّفہ: احمد دین (مصنّف سرگزشت)

مرتّبہ: ــــــــــ مشفق خواجہ

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۳ء میں طبع ہوئی تھی اور اس ایڈیشن کے تمام نسخے جلا دیئے گئے تھے۔ دوسری مرتبہ یہ کتاب ۱۹۲۶ء میں ترمیموں اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ نئے ایڈیشن میں متن ۱۹۲۶ء کے ایڈیشن پر مبنی ہے اور ۱۹۲۳ء کے ایڈیشن کے تمام حذف شدہ مباحث اور اختلافات کو کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

کتاب کے شروع میں مرتب نے طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں احمد دین کے حالاتِ زندگی ادبی حلقوں اور علاّمہ اقبال سے تعلقات کی تفصیل پیش کی گئی ہے

صفحات: ۵۲۸　　قیمت: ۴۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱۴

شائستہ خان

اسرارِ خودی کا ایک فراموش شدہ ایڈیشن

اے امام اے سیّدِ والا نسب
دودمانت فخرِ اشرافِ عرب
سلطنت را دیدہ افروز آمدی
عقلِ کُل را حکمت آموز آمدی
آشنائے معنیٔ بیگانہٗ
جلوہٗ شمع مرا پروانہٗ!!
مرغِ فکرم گلستاں ہا دیدہ است
از ریاضِ زندگی گل چیدہ است
ایں گل از تارِ رگِ جاں بستہ ام
تازہ تر در دستِ تو گل دستہ ام
بود نقشِ ہستیم انگارہٗ
ناقبولے، ناکسے، ناکارہٗ
عشق سوہاں زد مرا آدم شدم
عالمِ کیف و کمِ عالم شدم
حرکتِ اعصابِ گردوں دیدہ ام
در رگِ مہ دورۂ خوں دیدہ ام
بہرِ انساں چشمِ من شبہا گریست
تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست
از درونِ کارگاہِ ممکنات
بر کشیدم سرِّ تقویمِ حیات
من کہ ایں شب را چو مہ آراستم
گردِ پاے ملّتِ بیضا ستم
ملّتے در باغ و راغ آوازہ اش
آتشِ دلہا سرودِ تازہ اش
ذرّہ کشت و آفتاب انبار کرد
خرمن از صد رومی و عطار کرد
آہ گرمم، رختِ بر گردوں کشم
گرچہ دودم از تبارِ آتشم
خامہ ام از ہمّتِ فکرِ بلند
راز ایں نہ پردہ در صحرا فگند
قطرہ تا ہم پایۂ دریا شود
ذرّہ از بالیدگی صحرا شود
ملّت از جسم است شاعر چشمِ اوست
جسم را از چشمِ بینا آبروست
چشم از نورِ محبّت روشنم
اشک بار از دردِ اعضائے تنم
نذرِ اشکِ بے قرار از من پذیر
گریۂ بے اختیار از من پذیر

(اسرارِ خودی: پہلا ایڈیشن، ۱۹۱۵ء)

یہ اقبال کی دو قسطوں میں خارج شدہ ایک منظوم پیش کش کا مکمل متن ہے جس کا عنوان ہے "بحضور سر سید علی امام"

اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن (۱۹۱۵ء) میں موجود ۹ اشعار پر مشتمل اس پیش کش کو جب دوسرے ایڈیشن میں شامل کیا جانے لگا تو گیارہ شعر (نمبر چھ تا نمبر سولہ) خارج کر دیے گئے۔ اور اب یہ پیش کش آٹھ اشعار پر باقی رہ گئی۔ چوں کہ اسرارِ خودی کے اس دوسرے ایڈیشن میں اس انتساب کے شامل رہنے کی بات عبدالمجید سالک سے لے کر جاوید اقبال تک، اقبال شناسوں پر عام طور سے بہت واضح نہیں ہے۔ اس لیے یہاں دوسرے ایڈیشن میں شامل پیش کش کے اشعار کا عکس دیا جا رہا ہے۔ عکس اس لیے کہ اس پوری بحث میں حیرت ناک طور سے سر علی امام کے نام انتساب کی ترمیم شدہ شکل کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اسرارِ خودی کے اس ایڈیشن کو اقبالیات کی تاریخ سے اس طرح کھُرچ دیا گیا ہے کہ اس کے عدم اور وجود دونوں برابر ہو گئے ہیں۔ اور اب سب نے متفقہ طور پر تیسرے ایڈیشن کو دوسرا ایڈیشن قرار دے لیا ہے۔ اب یہ بات کسی کو یاد نہیں رہی ہے کہ اقبال نے اسرارِ خودی کے دوسرے ایڈیشن میں صرف ان اشعار کو خارج کیا تھا جو حافظ کے متعلق تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے پہلے ایڈیشن کا طویل دیباچہ بھی ختم کر دیا تھا اور اس کی جگہ ایک صفحے کا مختصر دیباچہ اس دوسرے ایڈیشن کے لیے لکھا تھا جس کا عکس ہم پیش کر رہے ہیں۔ اس دوسرے ایڈیشن کے دیباچے کے عکس میں آپ خود اقبال کی اپنی یہ عبارت بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں جس میں انھوں نے یہی دونوں باتیں (حافظ اور دیباچۂ اوّل کے متعلق) بڑی وضاحت سے کہہ دی ہیں۔ یعنی حافظ کا ذکر تو ہے مگر علی امام کے تعلق سے ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے۔ جہاں تک علی امام کا تعلق ہے، اس دوسرے ایڈیشن میں انتساب اپنی جگہ موجود ہے جیسے آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ بس کچھ اشعار کم کر دیے ہیں۔ جو خود شاعر کی اپنی مدح میں تھے۔ تاہم شاعر کی اپنی مدح میں سارے اشعار اب بھی خارج نہیں کیے گئے۔ لیکن تعداد کم کر دینے سے ایک توازن ضرور آ گیا۔ جس سے نظم کا ڈھیلا ڈھالا پن ختم ہو گیا۔ اور مناسب کیفیت پیدا ہو گئی۔

تو اب نظم کا عکس ملاحظہ ہو جو اسرارِ خودی کے دوسرے ایڈیشن کے دو صفحوں، صفحہ ۳، ۴ پر شائع ہوئی ہے، ترمیم شدہ ضرور ہے لیکن اپنی پوری ہستی اور پورے وجود کے ساتھ ہمارے سامنے ہے اور بار بار دُہرائے جانے والے ان معروضات کی مجسّم تردید بن جاتی ہے کہ اقبال نے اسے دوسرے ایڈیشن سے تمام و کمال خارج کر دیا تھا!

آیئے اتنی بات پھر دُہرا لیں، کہ اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن کو اقبال نے سر علی امام کے نام معنون کیا۔ یہ انتساب انیس[19] اشعار پر مشتمل تھا۔ دوسرے ایڈیشن میں انھوں نے اس انتساب میں تناسب لانے کے لیے اس میں سے وہ سارے (گیارہ) اشعار الگ کر دیے جو خود اقبال کی اپنی مدح میں تھے (جسے اردو تنقید کی اصطلاح میں شاعرانہ تعلّی کہہ لیجیے)۔

مگر پھر ہوا یہ کہ ان اشعار کو اقبال نے اس جگہ سے تو ضرور ہٹایا لیکن بالکل عاق نہیں کر دیا بلکہ آگے جا کے اسرارِ خودی کے اس باب میں جگہ دے دی جسے انھوں نے تمہید کا عنوان دیا ہے۔ جہاں اس قسم کے اور بھی دوسرے اشعار پہلے سے موجود تھے، اس لحاظ سے یہ انتساب سے الگ کیے گئے اشعار تمہید میں اپنی جگہ پا کر نہایت خوبی سے کھپ گئے جیسے ان کی اصل جگہ یہی تھی۔ اور انتساب جو اب صرف آٹھ اشعار پر مشتمل رہ گیا اپنی جگہ نہایت موزوں، چست اور نک سک سے درست ہو گیا۔

٣

الاصلاح لائبریری ... DESNA--PATNA
Acc 39718

پیشکش

بحضور

سر سیّد علی امام مدظلہ العالی

اے امام! اے سیدِ والا نسب
دودمانت فخرِ اشرافِ عرب

سلطنت را دیدہ افروز آمدی
عقلِ کل را حکمت آموز آمدی

آشنائے معنیِ بیگانۂ
جلوۂ شمعِ مرا پروانۂ

مرغِ فکرم گلستانہا دیدہ است
از ریاضِ زندگی گل چیدہ است

٤

این گل از تارِ رگِ جاں بستہ ام
تازہ تر در دستِ تو گلدستہ ام

ملت ار جسم است شاخ چشمِ او
جسم را از چشمِ بینا آبرو ست

چشمم از نورِ محبت روشنم
اشکبار از دردِ اعضائے تنم

نذرِ آستانت عقیدہ اے از من پذیر
گریۂ بے اختیار از من پذیر

"سرودِ رفتہ" کے مرتبین غلام رسول مہر اور صادق علی دلاوری، صفحہ ۶۸ پر لکھتے ہیں:

"اشعار ذیل اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن میں بطریقِ انتساب درج تھے۔ دوسرے ایڈیشن میں یہ حذف کر دیے گئے مگر بعض اشعار کو تمہید میں جگہ دے دی۔"

اقبال شناسی میں ان سب لوگوں کا بڑا درجہ ہے۔ مبادا ایسا ہو کہ ان کی اپنی لاعلمی یا غلط فہمی کے نتیجے میں بعد کے لوگ گمراہ ہوتے رہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس مختصر نوٹ کی ہر شق کے بارے میں عرض کر دیا جائے۔ ان کا بیان اُوپر نقل ہو چکا ہے جو اس جملے سے شروع ہوتا ہے جسے ہم پھر تجزیاتی طور سے دُہراتے ہیں:

(۱) "اشعار ذیل اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن میں بطریقِ انتساب درج تھے۔" اس کے بعد یہ لوگ لکھتے ہیں:

(۲) "دوسرے ایڈیشن میں یہ حذف کر دیے گئے۔"

(۳) "مگر بعض اشعار کو تمہید میں جگہ دے دی۔"

واقعہ یہ ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں گیارہ اشعار پیشکش سے نکال کر تمہید میں منتقل کر دیے گئے۔ باقی نہ پیش کش

حذف ہوئی نہ بقیہ اشعار، بات صرف اتنی ہے کہ دوسرے ایڈیشن کو دیکھے بغیر یہ بیان سُنی سُنائی پر جاری کر دیا گیا ہے۔ اس بیان کے الفاظ "بعض اشعار" کے ابہامی انداز سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں کے سامنے یہ بات مطلق نہیں آئی کہ وہ "بعض اشعار" کون تھے جن کو تمہید میں جگہ دی اور وہ بعض اشعار کون سے تھے جن کو تمہید میں جگہ نہیں ملی۔ اور پھر اگر تمہید میں جگہ نہیں ملی تو وہ گئے کہاں!

دراصل یہ بیان پرائے ہاتھ پر بھروسہ کر کے (بلا حوالہ) نقل کر دیا گیا ہے۔ اور اس طرح کی نقل در نقل میں جہاں بغیر ذاتی محنت کے کریڈٹ لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ ہوتا ہے کہ دس میں نو بار تو یہ معاملہ لوگوں پر نہیں کھلتا لیکن ایک بار سامنے آجاتا ہے تو CREDIBILITY مجروح ہو جاتی ہے۔ یہی اس بیان کے ساتھ ہوا کہ انھوں نے اپنے پیش رو عبدالواحد معینی مرتب "باقیاتِ اقبال"، کے بیان پر آنکھ بند کر کے یقین کرتے ہوئے اسے مِن وعَن نقل کر دیا تھا حالاں کہ منقول عنہ خود ہی بے بنیاد بیان دے رہے تھے[1]

ع آنکس کہ خود، است کرا رہبری کند!

اسرارِ خودی کے دوسرے ایڈیشن میں یہ تمہید صفحہ ۵ سے صفحہ ۷ تک پھیلی ہوتی ہے۔ یہ تمہید نظیری کی غزل کے ایک شعر سے شروع ہوتی ہے، اس میں کل ۹۴ اشعار ہیں۔ زیرِ بحث اشعار، شعر نمبر ۵۷ کے بعد مسلسل چلتے ہیں اور صفحہ ۱۵ سے گزر کر صفحہ ۱۵، ۱۶ کا عکس بھی اس لیے دیا جا رہا ہے کہ وہ اشعار اپنی جگہ پر پہچان لیے جائیں۔ ان اشعار کو نشان زد "×" کر دیا گیا ہے۔ (دیکھیے ص ۱۴)

پہلے ایڈیشن میں جو نظم یکجا تھی دوسرے ایڈیشن میں ایک خوبصورت تناسب لانے کے لیے اقبال نے اسے دو لخت کر دیا ہے۔ ایک حصّہ (آٹھ اشعار) انتساب میں برقرار ہے۔ دوسرا حصّہ (گیارہ اشعار) تمہید میں منتقل کر دیا ہے۔ یہ دونوں حصّے آگے مکمل ثبوت کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔

اس طرح پوری نظم آپ ملاحظہ کر سکیں گے۔ مگر مناسب تر یہ ہے کہ صداقت نامے کے طور سے اس دوسرے ایڈیشن کا سرورق اور دیباچہ بھی پیش کر دیا جائے تاکہ اقبال شناسوں میں کسی قسم کا التباس یا اشتباہ آئندہ کبھی بھی راہ نہ پا سکے۔ پہلے سرورق اور پھر دیباچہ۔ (دیکھیے ص ۱۵)

---

[1] عبدالواحد معینی نے یہ بیان کہیں سے لیا ہے یا خود تحقیق کیا، یہ کہنا مشکل ہے۔ اگر کہیں سے لیا تھا تو ان کا مآخذ کیا تھا۔ ایک غلط بات کے لیے ہمارا یہ بتانا بھی آسان نہیں۔ اس بحث میں ہم یہ بھول جائیں گے کہ بالکل واضح طور سے آپ پر ثابت کر دیں کہ "سرودِ رفتہ" کا بیان "باقیات" سے ماخوذ ہے۔ یہ بات یہاں کہنا اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے محققین اپنے پیش روؤں سے بلا حوالہ نقل کر لیتے ہیں اور کریڈٹ خود لے لیتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی یہ بات گرفت میں آجاتی ہے۔ پھر جب خود حوالۂ اوّل غلط ثابت ہو جاتا ہے تو حوالۂ ثانی بیچارہ کہاں ٹھہرے گا، جیسا کہ اس معاملے میں ہوا۔ اس لیے دونوں کو آمنے سامنے رکھ دیں۔

"باقیات" (صفحہ ۱۲۳) مرقومہ ذیل اشعار "اسرارِ خودی" کے پہلے ایڈیشن میں بطریق انتساب درج تھے۔ دوسرے ایڈیشن میں انتساب حذف کر دیا گیا مگر بعض اشعار کو تمہید میں جگہ دی۔ یہاں کل اشعار یکجا پیش کیے جاتے ہیں۔

"سرودِ رفتہ" (صفحہ ۲۸) اشعار ذیل "اسرارِ خودی" کے پہلے ایڈیشن میں بطریق انتساب درج تھے۔ دوسرے ایڈیشن میں یہ حذف کر دیے گئے۔ مگر بعض اشعار کو تمہید میں جگہ دے دی۔ یہاں کُل اشعار یکجا پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۵

زین سخن آتش به پیراہن شدم
مثل نے ہنگامہ آبستن شدم

چون نوا از تارِ خود برخاستم
جنتے از بہرِ گوش آراستم

برگرفتم پردہ از رازِ خودی
وانمودم سرِّ اعجازِ خودی

بود نقشِ ہستیم انگارۂ
ناقبولے ناکسے ناکارۂ

عشق سوہان زد مرا آدم شدم
عالمِ کیف و کمِ عالم شدم

حرکتِ اعصابِ گردون دیدہ ام
در رگِ مہ گردشِ خون دیدہ ام

بہرِ انسان چشمِ من شبہا گریست
تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست

۱۶

از درونِ کارگاہِ ممکنات
برکشیدم سرِّ تقویمِ حیات

من کہ این شب را چو مہ آراستم
گردِ پائے ملتِ بیضا ستم

ملتے در باغ و راغ آوازہ اش
آتشِ دلہا سرودِ تازہ اش

ذرہ کشت و آفتاب انبار کرد
خرمن از صد رومی و عطار کرد

آہِ گرمم رخت بر گردون کشم
گرچہ دودم از تبارِ آتشم

خامہ ام از ہمتِ فکرِ بلند
رازِ این نہ پردہ در صحرا فگند

قطرہ تا ہم پایۂ دریا شود
ذرہ از بالیدگی صحرا شود

مثنوی مسمّیٰ

اسرارِ خودی

یعنی

حقائقِ حیاتِ فردیہ

از

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم۔ اے بیرسٹر ایٹ لا لاہور

بفرمائش

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری گیٹ لاہور

[illegible]

[illegible]

دیباچہ

اس مثنوی کی پہلی ایڈیشن ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی تھی اب دوسری ایڈیشن میں جواب ناظرین کی خدمت میں پیش کیجاتی ہے بعض بعض جگہ لفظی ترمیم ہے بعض جگہ اشعار کی ترتیب میں فرق ہے اور ایک آدھ جگہ تشریح مطالب کیلئے اشعار کا اضافہ ہے لیکن سب سے بڑی ترمیم یہ ہے کہ اس ایڈیشن سے وہ اشعار خارج کردیئے گئے ہیں جو خواجہ حافظ پر لکھے گئے تھے۔ اگرچہ ان سے محض ایک ادبی نصب العین کی تنقید مقصود تھی اور خواجہ حافظ کی شخصیت سے کوئی سروکار نہ تھا تاہم اس خیال سے کہ یہ طرز بیان اکثر احباب کو ناگوار ہے میں نے ان اشعار کو نکال کر ان کی جگہ نئے اشعار لکھدیئے ہیں جن میں اس اصول پر بحث کی ہے جسکی رو سے میرے نزدیک کسی قوم کی لٹریچر کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا چاہیئے۔ پہلی ایڈیشن کے اردو دیباچے کی اشاعت بھی ضروری نہیں سمجھی گئی۔

محمد اقبال

ممکن ہے کسی اور سبب سے بھی اقبال نے دوسرے ایڈیشن سے یہ اشعار کم کیے ہوں لیکن ایک سبب یہ ضرور ہے کہ وہ قلم زد اشعار مطالب کو تیزی سے آگے نہیں بڑھا رہے تھے بلکہ پوری روانی میں کچھ کھنچاوٹ، کچھ سُکر پٹن لا رہے تھے۔

اس کتاب کو نکال دینے کے سلسلے میں متعدد کہانیاں گڑھی گئیں۔ کہانیاں گڑھنے کا ہر ایک کو حق ہے لیکن سب سے زیادہ تعجب جاوید اقبال صاحب پر ہوتا ہے جنھوں نے اپنی معرکہ آرا کتاب[1] میں یہ مسئلہ بھی چھیڑا ہے۔ اقتباس طویل ہے مگر ہمارے لیے اس کا نقل کرنا بھی ناگزیر ہے۔ جس کے بغیر یہ بات پوری طرح واضح نہ ہو پائے گی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"۱۹۵۱ء میں اسرارِ خودی"...... شائع ہوئی ...... یہ سر سیّد علی امام کے نام معنون کی گئی تھی ..... اعتراض کیا گیا کہ جس کتاب میں فلسفۂ خودی تشریح کی گئی ہو اور قوم کو خودداری کی تعلیم دی گئی ہو اسے ایک خطاب یافتہ اور دنیا دار کے نام پر معنون کیوں کیا گیا ہے"

اس پر جاوید اقبال نے معذرتاً لکھا ہے[2]

"ابتدائی ایام میں اقبال کی زبردست خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح حیدرآباد دکن کو اسلام کی دینی، فکری، علمی اور تمدنی حیات کا مرکز بنایا جائے۔ وہ خود بھی وہاں کوئی مناسب ملازمت حاصل کر کے منتقل ہونا چاہتے تھے۔ اور نظام کی سرپرستی میں تصنیف و تالیف کا کام کرنے کے آرزومند تھے۔ حیدرآباد کے علم دوست اور بااثر شخصیتوں سے ان کی واقفیت تھی۔ نواب میر محبوب علی خان انتقال کر چکے تھے اور نواب میر عثمان علی خان نظام تھے۔ ۱۱ر جنوری ۱۹۱۲ء کو مہاراجہ کشن پرشاد نے مدار المہام کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور یکم دسمبر ۱۹۱۴ء تک نواب میر یوسف علی خان سالار جنگ مدار المہام رہے۔ پھر نظام نے دیوانی اور وزارت کا قلم دان خود سنبھال لیا۔ بس جس زمانے میں مثنوی "اسرارِ خودی" شائع ہوئی، سر سیّد علی امام حیدرآباد کے وزیر اعظم نہ تھے بلکہ نظام نے خود وزارتِ عظمیٰ سنبھال رکھی تھی اور مملکتِ حیدرآباد بتدریج تنزلی سے اصلاح کی جانب گامزن تھی۔ البتہ چوں کہ نظام کے لیے بیک وقت سربراہی اور وزارت میں دخل رکھنا ممکن نہ تھا اس لیے افواہ گرم تھی کہ انگریزی حکومت سے سر سیّد علی امام کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔ اقبال کا یہ خیال تھا کہ اس مرحلے پر اگر سر سیّد علی امام وزیر اعظم مقرر ہو گئے تو ممکن ہے ریاست میں اسلامی تمدنی احیا کے لیے کوئی مثبت قدم اٹھایا جا سکے۔ اسی توقع کے پیشِ نظر مثنوی کی اشاعتِ اوّلین کو سر سیّد علی امام کے نام معنون کیا گیا بالآخر سر سیّد علی امام کا تقرر بطورِ صدر المہام ۱۹۱۹ء میں ہوا۔

انھوں نے ریاستی ترقی کے لیے کئی منصوبے تیار کیے تھے جن میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام بھی تھا۔ ۱۹۲۲ء میں وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔"

"معذرت" میں یوں تو منشی طاہر الدین کے نام وہ خط ہی کافی تھا جو خود جاوید اقبال نے دو وجوہ میں سے ایک وجہ

---

[1] "زندہ رود" جاوید اقبال۔ ص: ۲۷ - ۲۰۶　　[2] ایضاً

کے طور پر درج کیا ہے جس میں اقبال نے سر علی امام کے بارے میں اپنا دل کھول کے رکھ دیا ہے۔ اقبال کے بارے میں یہ تو معلوم ہی ہے کہ وہ جب کسی سے متاثر ہوتے تھے تو پھر بے تحاشا تعریف کرنے لگتے تھے اور اس کی پوری شخصیت کو صرف اس ایک خوبی میں ڈھال لیا کرتے تھے جو انھیں پسند آجاتی تھی (مثال، مسولینی)۔ اوروں کو جانے دیجیے سید سلیمان ندوی کو جو شخص "استاذ الکل" اور علومِ اسلامیہ کی جوئے شیر کے فرہاد جیسے الفاظ سے مخاطب کرے، سر علی امام کے سلسلے میں اسی خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان سے بھی اسی طرح بے تحاشا متاثر تھے۔ ایسا تاثر جو "اسرارِ خودی" ۱۹۱۵ء سے سفر انگلستان ۱۹۳۱ء تک قائم اور جاری رہا جب وہ گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے ہندوستان کے نمائندوں کے طور سے ایک ہی جہاز میں ہمسفر تھے، اقبال نے اس موقع پر اپنے خط میں لکھا ہے[1]:

"سر علی امام کو عربی فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار یاد ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں الولد سرّ لابیہ ان کے والد ماجد مولانا نواب امداد امام اثرؔ ادبیاتِ اردو میں بھی خاص پایہ رکھتے تھے ..... گول میز کانفرنس میں ہندو مسلمان نمائندے شاید آٹھ ہیں۔ چار مسلمان نمائندے ہیں اور چاروں مغرب زدہ۔ مغرب زدہ مسلمان کی اصطلاح شاید معارف نے وضع کی تھی، نہایت پُر لطف ہے۔ لیکن مسلمانوں کے اس مغرب زدہ قافلے کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں دو حافظِ قرآن ہیں۔ یعنی نواب صاحب چھتاری اور خان بہادر حافظ ہدایت حسین۔ سید علی امام کی مغرب زدگی کی کیفیت یہ ہے کہ ایک روز صبح کے وقت عرشہ جہاز پر کھڑے تھے۔ میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ میل و فرسنگ کا حساب کر کے کہنے لگے۔ دیکھو بھائی اقبال اس وقت ہمارا جہاز ساحلِ مدینہ کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ یہ فقرہ ابھی پورے طور سے ان کے منہ سے نکلا بھی نہ تھا کہ آنسوؤں نے الفاظ پر سبقت کی۔ ان کی آنکھ غم ناک ہوگئی اور بے اختیار بولے بلّغ سلامی روضۃ فیھا النبی المحترم ان کے قلب کی کیفیت نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔ باقی رہا میں، مغرب زدہ بھی ہوں اور مشرق زدہ بھی۔ البتہ مشرقی ضرب میرے لیے زیادہ کاری ثابت ہوئی۔"

یہ خط آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔ ہمیں کہنا یہ ہے کہ اقبال جس وقت عالمِ ادب اور عالمِ اسلام کی نامور شخصیت بن چکے تھے اس وقت بھی ان کے دلی جذبات سر علی امام کے لیے اتنے ہی شدید تھے۔ حالاں کہ یہ وقت وہ تھا جب خود سر علی امام، اقبال سے تعلق رکھنے پر فخر محسوس کرتے ہوں گے۔ یہ خط جب لکھا گیا ہے اس وقت تک "اسرارِ خودی" کے بعد "رموزِ بے خودی" (۱۹۱۸ء) ہی نہیں، "پیامِ مشرق" (۱۹۲۳ء) "بانگِ درا" (۱۹۲۴ء) "زبورِ عجم" (۱۹۲۷ء) بھی اشاعت ہو چکی تھی۔ اور ان کی کُل ہند شہرت مسلّم ہو چکی تھی۔ شاعر کے علاوہ ایک مفکّر اور متکلّمِ اسلام کی حیثیت سے بھی انھیں لوگوں کا احترام حاصل تھا۔ فکرِ اسلام کی تشکیلِ جدید پر ان کے چھ مشہور خطبے مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں میں ہو چکے تھے اور RECONSTRUCTION کے نام سے کتابی شکل میں بھی

---

[1] "زندہ رودِ" جاوید اقبال۔ ص: ۸ - ۲۰۷ (اس خط کا مکمل متن "خطوطِ اقبال"، مرتبہ: رفیع الدین ہاشمی صفحہ ۱۰ - ۲۰۸ دیکھیے)۔

آچکے تھے۔ (۱۹۰۰ء) ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر، مفکر اور متکلم کی جو حیثیت انھوں نے حاصل کرلی تھی اس میں اس وقت دُور دُور تک ان کا کوئی سہیم و شریک نہ تھا (مولانا آزاد کی "ترجمان القرآن" بھی اس وقت سامنے نہیں آئی تھی) بڑائی کے لیے تو اتنا ہی بہت تھا۔ لیکن انھیں تو دنیاوی بڑائیاں بھی اس عرصے میں حاصل ہو چکی تھیں "سر" کا خطاب مل چکا تھا (۱۹۲۳ء) الہ آباد میں مسلم لیگ کے تاریخ ساز کُل ہند اجلاس کی صدارت کر چکے تھے (۱۹۳۰ء) اور اب (۱۹۳۱ء) لندن کی گول میز کانفرنس کے لیے ہندوستان کی ملّتِ اسلامیہ کے چار بڑے نمائندوں میں سے ایک سر علی امام تھے تو ایک سر محمد اقبال! اور اس وقت اقبال جو خط لکھتے ہیں اس میں سر علی امام کے لیے وہ الفاظ ہیں جو آپ نے مندرجہ خط (بنام طاہر الدّین) میں ملاحظہ فرمائے۔

۱۹۱۵ء ("اسرارِ خودی" کا سالِ اشاعت) اور ۱۹۳۱ء (گول میز کانفرنس) کے موقعے سے طاہر الدّین کے نام خط کے درمیانی عرصے میں بھی سر علی امام کے لیے اقبال کے دلی جذبات و احساسات ویسے ہی پُرجوش، مخلصانہ اور پرستارانہ رہے۔ یہ ۱۹۱۹ء کے اکتوبر میں لکھے گئے کشن پرشاد کے نام ایک خط سے بھی ظاہر ہوتا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"سر سیّد علی امام اگر آپ کو اخِ معظّم کہتے ہیں تو حقیقتِ حال کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ نہایت نکتہ رس اور تعلقات کو نبھانے والے آدمی ہیں۔ عام زندگی میں ان کا بے تکلّفانہ انداز اور سادگی نہایت دل فریب ہے۔"

دراصل ہوا یہ کہ "اسرارِ خودی" کے اس انتساب کو صرف ایک عام سی مدحیہ نظم مان کر پڑھا گیا۔ پھر پڑھا گیا تو سمجھا نہیں گیا، اور سمجھا گیا تو فقط اتنا کہ علی امام کا قصیدہ ہے۔ یہیں یہ عرض کرنا ہے کہ برصغیر میں فارسی کا ذوق کم ہوتے جانے کے سبب اس انتساب کو ٹھیک سے پڑھا نہیں گیا ہے اور لوگ بس پیش کش بحضورِ سر سیّد علی امام' دیکھ کر حوصلہ ہار بیٹھے ہیں کہ ملّت کا محبوب ترین شاعر پیش کش اور بحضور کے الفاظ لکھے، کچھ اور آگے پڑھتے ہیں تو ابتدائی دو شعر پڑھ کے ڈھے جاتے ہیں! اقبال نے شاید ایسے ہی موقع کے لیے کہا تھا: کم نظر بے تابیٔ جانم نہ دید آشکارم دید و پنہانم نہ دید

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے کہ فارسی کا ذوق کم ہوتے جانے کے سبب ہمارے یہاں بہت سی غلط فہمیاں پائی جارہی ہیں۔ ایسی ہی ایک غلط فہمی یہاں بھی ہے۔ آشکارم کو بھی، جس سے مُراد اوّلین دو شعر ہیں (اے امام الخ، سلطنت را دیدہ الخ) اور پنہانم کو بھی (جس سے مُراد وہ سارے بقیہ اشعار ہیں جو اقبال نے خود اپنے متعلق کہے ہیں)۔ آیئے اب ان اشعار کو سیدھی اردو میں سمجھ لیں:

اے اعلیٰ نسب والے سیّد علی امام تُو وہ ہے جس کے خاندان پر عرب کے اشراف بھی فخر کرسکتے ہیں۔ وہ جو سلطنت کے (نظام) لیے دیدہ افروز بن کے آیا، وہ جس نے عقلِ کُل کو حکمت سکھائی۔ تُو ہے جو میرے دشوار طلب دقیق مفاہیم کا سمجھنے والا ہے اور میری شمع کے جلوے کا پروانہ بھی۔ میری فکر نے اپنی پرواز کے کتنے ہی گلستان دیکھے ہیں۔ پھر میں نے چمنستانِ زندگی سے کچھ پھول چُن لیے، پھر ان گلوں کو تارِ رگِ جاں سے باندھا ہے، اب یہ گل دستہ تیرے ہاتھ میں کیسا تازہ رہے گا! میری زندگی تو تجھے معلوم ہی ہے، ایک انگارۂ ناکس، ناقبول، ناکارہ، عشق نے تپا کے مجھے آدمی بنا دیا اور میں ساری کائنات کا عالم ہو گیا، ایسا عالم کہ آسمان کے اعصاب تک کی حرکت دیکھ سکتا ہوں۔ یہ دیکھ سکتا ہوں کہ چاند کی رگوں میں خون کیسے دوڑتا ہے۔ میری آنکھوں کو انسان کے لیے آنسو بہاتے کتنی راتیں گزری ہیں تب کہیں جا کے زیست کے اسرار کا پردہ چاک ہوا ہے۔ اس ممکنات کی دنیا میں دُور تک جا کر تقویمِ حیات کا راز میں نے پالیا ہے۔ میں جو اس زندگی کی رات کو چاند کی طرح آراستہ کیے ہوئے ہوں ملّتِ بیضا

کے لیے میری حیثیت بس اتنی ہے کہ میں اس کے پاؤں کی دھول ہوں، وہ ملّت جس کا باغ داغ ہیں شہرہ ہے، جس کی آواز کی گونج ہے، جس کے تازہ نغمے دلوں کو گرمی بخشنے والے، دلوں میں آگ لگانے والے ہیں۔ وہ نغمے جنہوں نے ذرّوں کو توڑ کر آفتابوں کے انبار لگا دیے اور سیکڑوں رومی اور سیکڑوں عطار پیدا کر دیے۔ میں تو مجسّم ایک گرم آہ ہوں جس کا نشانہ وہ اونچا آسمان ہے۔ ایسا دھواں ہوں جس میں آگ کی تپش ہے۔ فکرِ بلند کی ہمّت کے سہارے میرے قلم نے اس نوپر دے والے راز کو ایسی آسمانی بلندیوں سے اتار کے صحراؤں میں بکھیر دیا (طشت از بام کر دیا) تاکہ قطرۂ دریا کا ہم رتبہ ہو جائے، ذرّہ بڑھ کر خود ہی صحرا بن جائے۔ ملّت اگر جسم ہے تو شاعر اس کی آنکھ ہے اور کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ اس جسم کے لیے اگر آبرومندی ہے تو اس سے کہ اس کے پاس چشمِ بینا ہے۔ اور میں ہوں وہ آنکھ! میں جو نورِ محبّت سے روشن ہوں اور جسم کے ہر عضو کے دکھ سے دکھی اور اشکبار۔ یہ بے قرار آنسو اور یہ گریہ بے اختیار تیری نذر لایا ہوں، قبول ہو!!

پہلی نظر میں پوری نظم میں زیادہ سے زیادہ قابلِ اعتراض شروع کے دو شعر ٹھہرتے ہیں، ایسے نظر آتے ہیں جو اقبال کے مرتبے کے شایاں نہیں لگتے۔ آئیے دیکھیں:

وہ سیّد تھے اور اچھے نسب کے سیّد (نواب امداد امام اثر کے صاحبزادے) سیّدوں کا خاندان نسبِ رسالت سے عرب کے اشراف کے لیے بھی فخر کا باعث تھا اور امام سر علی کا نام تھا۔ پہلے شعر میں اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور اس میں بھلا قابلِ اعتراض بات کیا ٹھہرتی ہے۔

اگلے شعر میں یہ ہے کہ سلطنت کے لیے تُو دیدہ افروز ہے اور سلطنتِ ہند چلانے والے (عقل کل = وائسرائے) کے لیے حکومت آموز! وہ شخص جو ہندوستان میں سلطنت کے سربراہ، وائسرائے کی کونسل کا ممبر یعنی ہندوستان کا وزیرِ قانون ہو، وہ جس کی تحریک پر (منجملہ دوسرے محرّکوں کے) ہندوستان کی عظیم سلطنت کا دارالحکومت کلکتہ سے ایک دم تبدیل ہو کے دہلی آجائے۔ وہ جس کے زور ڈالنے سے اور مسلسل تحریک چلانے پر بہار اور اڑیسہ کو بنگال سے الگ ایک صوبے کی حیثیت عطا کر دی جائے، اور وہ جو آل انڈیا مسلم لیگ کے بانیوں میں شامل رہا ہو اور بنا پڑنے کے بعد اہم ترین اجلاسِ امرتسر کا صدر منتخب ہوا ہو (۱۹۰۸ء)۔ اور پھر ہندوستان کی تاریخ میں ہندو مسلم اتّحاد کو سب سے بڑا موڑ دینے میں جس کا ایک اہم رول رہا ہو۔ جس کے نتیجے میں "اسرارِ خودی" کی اشاعت کے کچھ ہی دن بعد کانگریس اور مسلم لیگ کے جلسے ساتھ ساتھ منعقد ہوئے اور دونوں ملّتیں لکھنؤ پیکٹ کی صورت میں (۱۹۱۶ء) ایک قوم بن کر ابھر آئیں۔ اس شخص کے واسطے سلطنت کے لیے دیدہ افروز، کے الفاظ استعمال کرنا کچھ اس کی واقعی حیثیت سے آپ کو کم نہیں لگتا؟

اس دوسرے شعر کا دوسرا مصرع قابلِ گرفت ضرور ٹھہرتا اگر ا مصرع کے معنی لینے کے لیے ہم بس یہیں پر رک جاتے کہ وہ (سر علی) عقلِ کل کو حکومت سکھانے والا ہے۔ اور عقلِ کل کے محدود اصطلاحی معنی لے لیتے۔ مزید براں یہ کہ صرف اس مصرع ہی کو پیشِ نظر رکھتے اور پہلے مصرع کو مطلقاً نظر انداز کر دیتے!

آئیے پورا شعر پھر پڑھیں: اس میں کہا گیا ہے کہ تُو سلطنت کے لیے دل افروز ہے اور عقلِ کُل کو حکومت سکھاتا ہے۔ یعنی سلطنت کے عقلِ کُل (وائسرائے) کو حکومت سکھانے کی بات ہے۔ اردو کی دو مستند ترین لغات، فرہنگ آصفیہ اور نور اللغات

ہمارے پیشِ نظر ہیں۔

عقل کل کے معنی فرہنگ آصفیہ کی رو سے ہیں "دانائے مشیر"۔ وہ مشیر جس کی رائے کے بغیر کوئی کام نہ کر سکیں؛ "مختارِ کل"۔ اور نور اللغات نے لکھا ہے کہ وہ مشیر جس کے بغیر کوئی کام نہ کر سکیں۔ مسئلہ ہندوستان کا تھا اس لیے اقبال کی ہم عصر لغات کا حوالہ دیا گیا۔ لیکن فارسی لغات کی رو سے بھی عقل کل کے معروف معنی عقلِ اوّل اور عقلِ اوّل کے قریب ترین معنی، اصل و حقیقت انسان ہے، اور حقیقت کی رو سے آدم صورت عقلِ کل ہے! (فرہنگِ آنندراج)

اقبال کے یہاں یہ توصیفی مبالغہ دوسرے محبوب افراد کے ساتھ بھی جا بجا دیکھا جا سکتا ہے۔

سوئے گردوں رفت تا داند کہ پیغمبر گذشت (مولانا محمد علی کے لیے)

آں کہ زد فکر بلندش آسماں را پشت پائے (گرامی کے لیے)

میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا۔ (حالی کے رنگ میں، خود اپنے لیے)

مہدیٔ آخر زماں ہم مصطفیٰ ــــ گفت اقبال اسم اعظم مصطفیٰ (مصطفیٰ کمال کے لیے)

اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُكَ (سرسید کی تاریخ وفات)

یعنی اقبال ایسا مبالغہ جا بجا روا رکھتے ہیں جس سے بظاہر ذہن ایک دم سے بوکھلا جائے کہ شخص موصوف کو کتنا بڑھا دیا لیکن غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ حدود کچھ لانگی نہیں گئی ہیں اور ہر جگہ بڑی مضبوط شاعرانہ تاویل موجود ہے۔

ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ہم نے اس شعر کی یہ تاویل کرنے کو تو کر لی مگر دل پورا مطمئن نہیں ہوا تھا، کہ اتفاق سے علی امام ہی کے لیے کہا گیا اقبال کا ایک اور شعر سامنے آ گیا اور بات سُلجھ گئی۔ یہ شعر اقبال نے سر علی امام کے لاہور آنے پر کہا تھا۔ شعر یوں ہے:

نگہدارِ حقوقِ اُمّتِ خیر البشر آیا مسلمانوں مبارک ہو امامِ منتظر آیا

پہلے مصرع سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ سر علی امام کے قدر داں تھے، تو اس لیے کہ سر علی "نگہدارِ حقوقِ اُمّتِ خیر البشر" تھے۔ لیکن دوسرا مصرع ہمارے لیے اہم تر ہے جس میں انھوں نے سر علی کو "امامِ منتظر" کہا ہے۔ کیوں کہ اسی سے پوری بات صاف ہو سکے گی۔ کسی کو امامِ منتظر کہنا مذہبی نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض بات سہی لیکن شاعر اقبال کے لیے فارسی اردو شاعری کی صدیوں کی وارستگی اور آزادہ روی کی روایات کے پس منظر میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی، بلکہ ایک عام سی شاعرانہ شوخی: امام سر علی کا نام ہے اور منتظر، وہ جس کا (لاہور آنے کا) انتظار ہو رہا تھا۔ ادھر شاعرانہ شوخی امام مہدی کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

یہی امامِ منتظر والی شوخی "عقلِ کل را حکمت آموزد آمدی" میں "عقلِ کل" کی ہے۔ جس طرح اوپر درج کردہ اردو شعر میں ایک خطرناک مرکّب لفظ میں آ گیا ہے اسی طرح یہ دوسرا خطرناک لفظ (عقلِ کل) اس مصرع میں بھی ہے جب کہ شاعر دونوں جگہ محض شوخیٔ تحریر سے کام لے رہا ہے۔ مطلب صرف اتنا ہے کہ یہ اعلیٰ ترین عقل مندی کو سارے عقل مندوں کو حکمت و عقل سکھانے والے ہیں۔

عبداللہ شاہ ہاشمی

فکرِ اقبال کا آفاقی پہلو

حکیم الامت علامہ اقبال چمنستانِ ملتِ اسلامیہ کے ایسے دیدہ ور ہیں جنھوں نے اپنے افکارِ عالیہ سے ہمیں جہاں بانی کے تقاضوں سے آشنا کیا جہاں بینی کے رموز بھی سکھائے۔ ان کی آواز "بانگِ درا"، بنی جس سے قافلۂ سخت جاں منزلِ آزادی کی طرف گامزن ہوا اور آزادی و استقلال کی نعمت پائی۔ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل انھیں وہ فہم و فراست اور چشمِ بینا نصیب ہوئی جس سے انھوں نے آنے والے دور کی جھلک دیکھی اور بے خطا مومنانہ بصیرت سے تقدیرِ اُمم کے راز سے پردہ اٹھایا۔ اور بلاشبہ وہ عظیم فلسفی شاعر ہیں جن کے افکار نے ایک پورے عہد کو متاثر کیا۔ مشرق و مغرب میں ان کے فکر و فن کا مطالعہ گزشتہ نصف صدی سے ہو رہا ہے۔ "اقبالی ادب" ایک علمی موضوع بن چکا ہے اور علامہ کا فلسفہ، شاعری اور فکر و فن جغرافیائی حدود سے ماورا ہو کر آفاقی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

علامہ اقبال کا کلام، خطبات، مضامین، ملفوظات اور مکتوبات پڑھ کر ان کی شخصیت کے متعدد پہلو سامنے آتے ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت کو مختلف خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ اور نہ یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ کون سا پہلو زیادہ پرکشش ہے اور کون سا کم ہے۔ انھوں نے بقول ایک نقاد اپنے لیے "بندۂ حق بیں و حق اندیش — درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی۔ اور "مردِ آفاقی" کے خالص انسانی معیار متعین کیے ہیں۔" اور ان کی نظم و نثر میں اس آفاقیت کا واضح اور گہرا احساس موجود ہے۔ نقادوں اور دانشوروں نے کلامِ اقبال کے بحرِ ذخار سے مختلف النوع مفاہیم اخذ کرنے کی سعی کی ہے۔ تاہم فکرِ اقبال کے آفاقی پہلو پر بالعموم سب نے اتفاق کیا ہے ماسوائے چند اشتراکی نقادوں کے۔ چوں کہ علامہ اسلام کے نشاۃِ ثانیہ کے داعی ہیں اس لیے ایسے نقادوں نے اقبال کی آفاقیت کی نفی کی ہے۔

فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

> "دل چسپ بات یہ ہے کہ ہمارے ترقی پسندوں نے جس استدلال کے سہارے اقبال کی آفاقیت کی نفی کی ہے بالکل اسی استدلال کے سہارے سوویت یونین کے ادبی نقاد اقبال کی عظمت کا اثبات کرتے ہیں۔ چناں چہ نکولائی آنی کیٹف کے نزدیک اقبال کی عظمت کا راز انسان کی ازلی ابدی اور آفاقی مسائل کی تجرید اور ماورائیت کی دھند سے نکال کر اپنے ماحول اور اپنے عہد کے سیاق و سباق میں سمجھنے اور اپنی قومی نشاۃِ ثانیہ کے تقاضوں کی روشنی میں

بیان کرنے میں مضمر ہے"۔ یعنی ؎ یوں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

علامہ اقبال عصرِ حاضر میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے داعی اور پیامبر ہیں۔ ؎

میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

اور اس نشاۃِ ثانیہ کو وہ محض اُمّتِ مسلمہ کے لیے ہی نہیں، پوری بنی نوع انسان کی فلاح کے لیے اہم سمجھتے ہیں۔ انھوں نے مختلف النوع تحریروں میں تاریخِ یونان سے لے کر پوری نشاۃِ ثانیہ کے دوَر کی فکر گزاریوں کا جائزہ لیا ہے اور قوموں کے عروج و زوال اور قوموں کی زندگی میں پیش آمدہ تمام نشیب و فراز کے اپنے مطالعے، مشاہدے اور غور و فکر کو موضوع بنایا ہے۔ ان کا اصولِ ارتقا تصوّرِ کائنات، انسان دوستی، بھائی چارہ اور اخوت، قومیت، بلکہ ملّت کا تصوّر، مردِ مومن، زمان و مکان، فلسفہ خودی وغیرہ ان کی آفاقیت ہی کے مختلف پہلو ہیں۔ ان کے افکار کے آفاقی ہونے میں ان کی قرآن فہمی، عشقِ رسولؐ (اقبال پر یہ فرمانِ رسولؐ صادق آتا ہے کہ "مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے") کا خاص حصّہ ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے "قدیم و جدید، مسلم اور غیر مسلم نظریات کو کھنگالا، تنقیدی اور تجزیاتی شعور و ادراک کی روشنی میں ان کی ان کی صحت و سقم کو جانچا اور پرکھا اور پھر خذ ما صفا دع ما کدر کے مطابق ان کے عطر سے اپنے منہجی فکر کا خاکہ مرتب کر کے تجربات و مشاہدات سے اس کے لیے سندِ تصدیق و توثیق حاصل کی اس بنا پر اس جدید علمِ کلام میں زیادہ پختگی گیرائی اور گہرائی ہے ——— اور علامہ کا علمِ کلام صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ پورے عالم کے لیے ہے۔ کیوں کہ ان کا مخاطب انسان بہ حیثیت انسان ہے۔

کائنات کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ انسانی وجود کے ساتھ کائنات کا تعلق کیا ہے؟ اس طرح کے سوالات پر قدیم و جدید فلاسفہ نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس مسئلہ پر اقبال کا نقطۂ نظر ارتقائی ہے۔ مغربی متفکرین نے اس کے مادی پہلو پر زور دیا ہے لیکن اقبال کے ہاں کائنات روحانی وحدات ہے جس میں عقلِ محض چراغِ راہ ہے۔ انھوں نے عشق کو امام و رہنما بنایا ہے جس کے بغیر تسخیرِ کائنات کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کے نزدیک قدرت کا تخلیقی عمل جاری ہے ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کُن فیکُون

کائنات کے بارے میں اقبال کے خیالات نظریۂ توحید کے تابع ہیں اور باوجودیکہ انھوں نے مختلف فلسفیوں کے نظریات سے استفادہ کیا، ان کا نظریۂ کائنات اصل میں اسلام کے آفاقی نقطۂ نظر کا مرہونِ منّت ہے۔

دانائے راز اقبال انسانیت کی عظمت اور سربلندی کے داعی ہیں۔ انسانیت دوستی ان کا شعار رہا۔ اس بندۂ حق بین و حق اندیش نے اپنے آپ کو کسی مخصوص طبقہ تک محدود نہ رکھا بلکہ ؎

درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند

ان کے ہاں انسانی وحدت اور اخوت کا جو عالمگیر تصوّر پایا جاتا ہے، دراصل وہ کلیتاً اسلام کے مسئلہ توحید کی دین ہے۔ اس چیز نے ان کے ہاں وسعت و آفاقیت پیدا کر دی ہے۔ اور اسی پہلو نے فکرِ اقبال کو دنیا کے دانشوروں کے لیے توجّہ کا مرکز بنایا۔ یہ اقبال کی عظمت کی دلیل ہے اور ان کی خوش بختی بھی کہ ان کی زندگی ہی میں ان کے افکار و نظریات اور اثرات کا دائرہ اس قدر وسیع ہو گیا

دورِ جدید میں مسئلہ قومیت اور وطن پرستی کے فتنے نے دنیا کو بہت متاثر کیا بلکہ قتل و غارت اور جنگ و جدال میں مبتلا کیا ہے۔ اقبال کے ہاں بھی مشقِ سخن کے ابتدائی دور میں خاکِ وطن سے "نیا شوالہ" بنانے کی باتیں موجود ہیں۔ لیکن یہ ان کے فکری ارتقا کا دور ہے۔ اس کے بعد انھوں نے مسلم قومیت کا تصور پیش کیا اور کہا ؎

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اس سے ان کے ہاں آفاقی رجحانات کا آغاز ہوا۔ جس نے آگے چل کر ایک عالمگیر نظریے کی صورت اختیار کر لی۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے نزدیک "اقبال کی آفاقیت کا ان کی شاعری سے گہرا تعلق ہے۔ ان کے خیال میں حصولِ عظمت ان کی شاعری کا مقصد ہے۔ وہ صرف مقصد کی عظمت ہی کے قائل نہیں بلکہ اس کے حصول کے لیے طریقِ کار کی عظمت کے بھی قائل ہیں۔ عظمت کے اس تصور نے اقبال کی شاعری کو ایک آفاقی حیثیت اور عالمگیر قدر بخشی ہے۔"

اقبال اور آفاقیت کی بات ہو تو کچھ مادیت زدہ دانشوروں کو اقبال کا اسلامی تشخص کھٹکنے لگتا ہے، حالاں کہ اسلام زمانی اور مکانی حدود سے ماورا ہے۔ اور اقبال مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کو صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں، پوری بنی نوع انسان کے لیے رستگاری کا سبب سمجھتے ہیں۔ اس لیے اقبال کے ہاں اسلام کا حوالہ درحقیقت آفاقیت کا حوالہ ہے۔ پروفیسر حمید احمد خان کے نزدیک اسلام اپنی حقیقت کے اعتبار سے عالمگیر اور آفاقی ہے۔ چناں چہ اقبال کی شاعری کی روح آفاقی ہے۔

اقبال کے ہاں مردِ مومن کا تصور نہایت جامع اور عالمگیر ہے۔ کچھ نقادوں نے کہا، یہ سب نٹشے کے اثرات ہیں۔ لیکن اقبال نے اس کی تردید کی۔ نٹشے ایک مخصوص طبقے کو جینے کا حق دیتا ہے۔ اقبال نسلی تفوق کے قائل نہیں ہیں۔ ان کا مردِ کامل بلا امتیاز مذہب و ملت اور رنگ و نسل سب کے لیے رحیم و شفیق ہے۔ وہ کسی مخصوص نسل یا قوم کے مفادات کا محافظ نہیں، پورے بنی نوع انسان کا طرفدار و حامی ہے۔ بذاتِ خود وہ انسانیت کا ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے۔ معروف ترقی پسند مجنوں گورکھپوری بھی مردِ مومن کی آفاقیت کے معترف ہیں۔ لکھتے ہیں:

"اس کی تخیل بہت بلند اور بے انتہا وسیع ہے اور اس میں وہ تمام فضائل موجود ہیں جو اعلیٰ سے اعلیٰ انسان میں پائے جا سکتے ہیں۔"

مردِ کامل کی آفاقیت کا ایک پہلو مکان و مقام سے اس کی ناوابستگی یا "بے مقامیت" ہے ؎

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے — اس کا مقام ہر کہیں ہے

کافر کی پہچان کہ آفاق میں گم ہے — مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اقبال کے نزدیک تشکیل و تعمیرِ انسانیت میں خودی مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔ اقبال کے نظریۂ خودی کی ابتدا من عرف نفسہ ہے۔ اور انتہا یہ ہے کہ وہ اللہ کی رضا بن جاتی ہے۔ اس میں اس قدر قوتِ جاذبہ ہے کہ ساری دنیا کا احاطہ کر لیتی ہے اور اس سے تسخیرِ فطرت ممکن ہے ؎

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی — خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش — خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

اقبال کے ہاں خودی کی آفاقیت مسلّم ہے۔ اور وہ کہتے ہیں ؎

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے　　نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر　　طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

مسلمانوں کے ہاں یہ سیاحت کی روایت ہجرت ہی کا ایک روپ ہے۔ اسلام کے ضابطۂ حیات کے وہ جملہ پہلو جو مقامیت سے ماورا ہیں اور جغرافیائی حدود کے پابند نہیں، اقبال کے افکار و نظریات پر اثر انداز ہوئے ہیں اور اقبال کے ہاں ان آفاقیت کے واضح اثرات موجود ہیں۔ مثلاً

؎ گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند

یا ؎ کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

زندگی کے بے شمار گوناگوں مسائل کی توضیح اقبال نے اسلامی نقطۂ نظر سے کی ہے۔ ان کے پیغام کی بقا، دوام اور ہمہ گیری کی وجہ یہی ہے کہ ان کے ہاں عالمی و آفاقی رنگ موجود ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری لکھتے ہیں:

"اقبال اپنے وسیع، بالاتر اور بلند تر نقطۂ نگاہ کے اعتبار سے آفاقی ہے۔ ملک و ملّت کے کے رنگا رنگ استوار رشتوں کے باوجود اقبال نے وحدتِ انسانیت کا خواب دیکھا۔ اس نے اپنے ملک کو بھی چاہا، اپنی ملّت سے بھی لو لگائی اور انسانیت سے بھی استوار رہا۔ اس کے ثبوت میں اقبال کے آخری مجموعہ کلام "ضربِ کلیم"، کی جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا ایک چھوٹی سی نظم "مکہ اور جنیوا" پیش کی جا سکتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ مِلَل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم" [۶]

حوالے

۱۔ "واہ کاریگر"، واہ کینٹ، اقبال نمبر
۲۔ سعید احمد اکبر آبادی "خطباتِ اقبال پر ایک نظر" ص ۱۲ اقبال اکادمی لاہور پاکستان ۱۹۸۷ء
۳۔ "اقبال اور اس کا عہد" ص ۱۱ ادارہ انیس اُردو الٰہ آباد (بھارت) ۱۹۶۴ء
۴۔ "اقبال کی شخصیت اور شاعری"، بزمِ اقبال، لاہور ۱۹۷۴ء
۵۔ "اقبال"، ص ۵۵ ایوانِ اشاعت، گورکھپور (بھارت)
۶۔ "خیابانِ اقبال"، ص ۳۰۲-۳۰۳ (مرتبہ: محمد طاہر فاروقی — خاطر غزنوی) یونیورسٹی بک ایجنسی، پشاور ۱۹۶۶ء

غزل نما

تعارف و انتخابِ کلام

ادا جعفری

ظہیر الدّین ظہیر دہلوی

نام ظہیر الدّین۔ تخلّص ظہیر۔ خطاب راقم الدّولہ۔

پیدائش ۱۸۲۵ء مطابق ۱۲۴۰ھ، وفات ۱۹۱۱ء مطابق ۱۳۲۹ھ

ظہیر کے والد کا نام میر جلال الدّین حیدر اور خطاب مرصّع رقم تھا۔ انھیں بھی شعر گوئی کا شوق تھا۔ شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔

ظہیر اعلیٰ مرتبت سیّد خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اجداد تیمور کے عہد میں اعلیٰ مناصب پر فائز ہوتے رہے۔ ان کے والد بہادر شاہ ظفر کے خوش نویسی میں استاد تھے۔ اور وہ خود بادشاہ کے داروغہ ماہی مراتب تھے۔ دربار میں حاضر رہنا اور ہر جگہ بادشاہ کے ہم رکاب رہنا ان کے فرائض میں تھا۔

ظہیر کی پرورش بہت ناز و نعم میں ہوئی تھی۔ فارسی اور عربی زبان کی تعلیم حاصل کی تھی۔ شاعری کا شوق کم عمری سے تھا۔ تیرہ چودہ سال کی عمر میں ذوق کی شاگردی اختیار کی۔

غدر تک ان کی زندگی نہایت آرام و آسائش کے ساتھ بسر ہوئی۔ غدر کے زمانے میں تباہ حال شہر شہر پناہ کی تلاش میں گھومتے ہوئے رام پور پہنچے اور وہاں نواب رام پور یوسف علی خاں کی مہربانی سے چار سال کے قریب قیام کیا۔ انگریزوں کی جانب سے عام معافی کا اعلان ہونے کے بعد دلّی واپس پہنچے۔ لیکن وہاں جب قرض خواہ نے ان کا آبائی مکان بھی حاصل کر لیا تو راجہ الور کی ملازمت اختیار کی۔ اسی زمانے میں میر مہدی مجروح بھی الور میں مقیم تھے۔ یہاں چند سال قیام کے بعد ظہیر ریاست جے پور میں ملازم ہو گئے اور وہاں کم و بیش انیس ۱۹ سال رہے۔ والیٔ ریاست کی وفات کے بعد ٹونک چلے گئے۔ آخری عمر حیدر آباد دکن میں بسر ہوئی اور وہیں انتقال ہوا۔

حیدر آباد میں خوش نہیں رہے۔ ستّر سال کی عمر کے بعد شاعری ترک کر دی تھی۔ ضعیف العمری میں اولاد کی موت کے صدمے بھی برداشت کیے۔

ظہیر پُرگو شاعر تھے۔ اپنے زمانے میں فنِ شعر اور زبان کے استاد مانے جاتے تھے۔ آخری دور کے نامور شعرا میں شمار ہوتا تھا۔ ان کے بہت سے شاگرد تھے۔

ظہیر ذوق کے شاگرد تھے لیکن کلام میں مومن کا رنگ ہے۔ اندازِ بیان میں تصنّع اور بناوٹ نہیں ہے۔ اشعار صاف ہیں۔

تین دیوان اور ایک نثر کی کتاب "داستانِ غدر" جوان کی سوانح عمری ہے ان کی یادگار ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ چوتھا دیوان میر اشتیاق حسین شوق دہلوی کے پاس تھا جو طبع نہیں ہوا۔ کچھ کلام غدر کے زمانے میں تلف ہو گیا۔

شاعری میں ان کی زبان وہی ہے جو مومن یا حالی کی غزل میں ملتی ہے۔ لیکن نثر کی کتاب "داستانِ غدر" میں اس زمانے کی عام بول چال کی زبان ہے۔

یہ انتخاب دیوانِ ظہیر، جلد اوّل مطبوعہ مطبع مفیدِ عام آگرہ۔
دیوانِ ظہیر جلد دوم، مطبوعہ مطبع کریمی بمبئی۔
دیوانِ ظہیر جلد سوم، مطبوعہ مطبع کریمی بمبئی سے کیا گیا ہے۔

انتخابِ کلام

مجھے اشارۂ ساقی سے مے پیے ہی بنی — سوالِ حرمتِ صہبا دوبارہ کیا کرتا
ہوس بھی اہلِ دول کے لیے ہے ورنہ فقیر — ہوائے تاج و سرِ گو شوارہ کیا کرتا

رندانِ بادہ کش کو بُلانا ضرور تھا — واعظ اگر بیانِ شرابِ طہور تھا

قاصد ہے پھر آخر کو فرشتہ تو نہیں ہے — کس طرح سے کہہ دوں کہ تصرّف نہیں کرتا

وہ تصوّر میں بھی آتے ہیں عدو کے ہمراہ — بدگمانی کی طرح دل میں پھرا کرتے ہیں

اے وہ بیانِ حالِ غیر، وصف نہیں گلہ سہی — ہم ہیں کہاں کے رازداں کوئی ہمیں سنائے کیوں

وائے تقدیر ترے بند قبا میں پڑ جائے — وہ گرہ جو کہ ترے کاکلِ پیچاں میں نہیں

گلے لب پہ آتے ہیں بے ساختہ — یہ باتیں مری اختیاری نہیں

ظہیر اُٹھو ذرا چل کر کرامات مغاں دیکھو — کہ رندانِ قدح کش محرمِ اسرار ہوتے ہیں

جُدا ہے زمانے سے اقلیمِ عشق — جہاں پُرسشِ کفر و ایماں نہیں
خدا کی خدائی میں سب چیز ہے — مگر دادِ خونِ شہیداں نہیں

یوں تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

چشمِ حق بیں سے حسینوں کو نظر کر زاہد
یہ وہ بندے ہیں خدا سے جو ملا دیتے ہیں

قیامت کے وعدے پہ کیا صبر آئے
وہ کافر کوئی حورِ جنت نہیں

تمہیں دل میں کچھ منفعل ہو تو ہو
ہمیں شکوہ سنجی کی عادت نہیں

کام آئیں تو محبت میں وفائیں آئیں
شکوے جب آئے زباں پر تو دعائیں آئیں

آدمی کے لیے زندانِ علم ہے دنیا
حاصلِ عمر یہاں رنج سوا کچھ بھی نہیں

دماغ شرح کہاں، قصہ مختصر یہ ہے
ستم زدہ ہیں تمہارے ستائے بیٹھے ہیں

نظر گزر کی ذرا میکشو! چھڑک دینا
کہ تاک حضرتِ واعظ لگائے بیٹھے ہیں

میں جانتا ہوں جو مرے خط کا جواب ہے
یارب! وہ نامہ بر کی زباں سے ادا نہ ہو

بتوں سے بچ کے چلنے پر بھی آفت آ ہی جاتی ہے
یہ کافر وہ قیامت ہیں طبیعت آ ہی جاتی ہے

یہ سب کہنے کی باتیں ہیں ہم ان کو چھوڑ بیٹھے ہیں
جب آنکھیں چار ہوتی ہیں مروّت آ ہی جاتی ہے

قتلِ عاشق میں برائی کیا ہے
اے پری رو تری شہرت ہی سہی

نہ کہیے اگر افسانۂ راز کیا کہیے
وہ رازداں ہے تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے

ظہیر قصۂ زلفِ بتاں ہے طولانی
زمانِ عمر بہت مختصر ہے کیا کہیے

زاہد کو طاعتوں سے ہے جس شے کی گفتگو
رندِ سیاہ کار کی وہ التجا میں ہے

پُرسش ہو ان کی بزم میں اپنی، یقیں نہیں
یہ بات تو کسی کی بنائی ہوئی سی ہے

چاہت کا جب مزا ہے کہ وہ بھی ہو بے قرار — دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

کون زیرِ آسماں باقی رہا — نیک ناموں کا نشاں باقی رہا
رفتہ رفتہ چل بسے دل کے مکیں — اب فقط خالی مکاں باقی رہا
کاروانِ منزل پہ پہنچا عمر کا — اب غبارِ کارواں باقی رہا

خداوندا محبت دے حسینوں کی تو دولت دے — ستم ہے چاہ میں عاشق کا بے مقدور ہو جانا

مایوس کر نا رحمتِ باری سے محتسب — دل توڑنا گناہ ہے امیدوار کا

تیری شوخی دشمنِ شرم و حیا تھی میں نہ تھا — پردہ در اے خود نما تیری ادا تھی میں نہ تھا
آبرو رکھی خدا نے حشر میں اچھا ہوا — داد خواہوں میں ترے خلقِ خدا تھی میں نہ تھا

تمہارا ٹوٹھکانا جا بجا ہے — ہمیں تم نے نہیں رکھا نہیں کا

کسی کی دشمنی سے کچھ کسی کا ہو نہیں سکتا — خدا چاہے تو کچھ بندے کا چاہا ہو نہیں سکتا

توڑا ہے محتسب نے جو سامانِ مے کشی — ہوتا نہیں ہے دل شکنی کا عذاب کیا
ہوتے ہیں دوستوں کے دلوں میں معاملے — میری وفا تمہاری جفا کا حساب کیا

کیوں خال سیہ مصحفِ رخ کا ہے نگہباں — ہندو کو کبھی حافظ قرآں نہیں دیکھا

تاراج کیا متاعِ دل کو — لوٹا ہے بتوں نے گھر خدا کا

فرمائیے جدید ٹھکانا کہاں ہے اب — کچھ آپ سے رقیب بہت بدگماں ہے اب
تم جس کو ڈھونڈتے ہو نہیں وہ ظہیر ہے — کمبخت ملنے جلنے کے قابل کہاں ہے اب

ٹھٹھا نہیں ہے کھیل نہیں کسبِ علم و فن
اک عمر کھو کے پاتے ہیں انساں جہاں میں نام

دعویٰ نہیں ہے اس کا کہ اہلِ زباں ہیں ہم
ہاں یادگارِ قافلۂ رفتگاں ہیں ہم

کیا جانے کوئی کون ہیں کیا ہیں کہاں ہیں ہم
جس سرزمیں پہ ہیں وہیں آسماں ہیں ہم

ملنے کو جس سے چاہو ملو اس کا غم نہیں
یہ دل میں سوچ لو کہ بڑے بدگماں ہیں ہم

ایسے وعدے ہزار ہوتے ہیں
یہ نہیں اعتبار کی باتیں

زہر ہیں، قہر ہیں، قیامت ہیں
دلِ ناکردہ کار کی باتیں

مقدر جب بگڑتا ہے تو پھر اعمالِ بد اپنے
نگاہوں میں پری زادوں کی صورت بن کے آتے ہیں

یہ وہ حرفِ تمنا ہیں سمجھ لو جس طرح چاہو
حکایت بن کے آتے ہیں شکایت بن کے آتے ہیں

جورِ عدو سہے بُتِ ناآشنا کے ساتھ
کرنی پڑی ہی وفا ہمیں اک بے وفا کے ساتھ

نہ میری وحشتیں بے کار سمجھو
تم اپنی گرمیٔ بازار سمجھو

پڑا رہنے دو تم کوچے میں اپنے
مجھے بھی سایۂ دیوار سمجھو

مرا یہ گریۂ اشکِ ندامت
نزولِ رحمتِ غفار سمجھو

کبھی مسجد کو گئے ہم کبھی میخانے کو
کبھی توبہ کو ہے توڑا کبھی پیمانے کو

دل بھی کمبخت کسی طور سے مانے نا ہے
میں تو آنکھوں پہ رکھوں آپ کے فرمانے کو

زبانیں قطع ہوتی ہیں جنھیں ملتی ہے بے تابی
روایت کر نہیں سکتے حقیقت دیکھنے والے

نگاہِ شوق تو رکتی نہیں ہے سات پردوں میں
بُرے ہوتے ہیں اے حضرت سلامت دیکھنے والے

سچ تو یہ ہے نہ پڑھی ہے نہ قضا کی زاہد
نہ تیمم مجھے آتا نہ وضو آتا ہے

اک گونہ تعلق تو ہے گو ہو وہ عداوت — اچھی ہے کدورت بھی کسی آئینہ رو کی

توبہ تو بہ غیر پیماں کی طبیعت آئے گی — یہ وہ آنکھیں ہی نہیں جن میں محبت آئے گی

خدا ملتا ہے ڈھونڈنے سے اگر انسان جو یا ہو — مگر ہاں آدمی کو آدمی مشکل سے ملتا ہے

باغِ ہستی میں نہ ہوگا کوئی ہم سا بدنصیب — مال سے بہرہ نہیں، لہنا نہیں اولاد سے

غزل نما

قدیم شعرا کا تعارف و انتخاب کلام

ادا جعفری

"قومی زبان" میں شائع ہونے والے انتخابات

کتابی شکل میں

شائع ہو گئے ہیں

انجمن کی اجازت سے "غزل نما" ہندوستان میں مکتبہ جامعہ نئی دلّی نے شائع کیا ہے۔

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ کراچی ۱

ڈاکٹر داؤد رہبر

دو خط

۱۰ فروری ۱۹۸۹ء

قبلہ ڈاکٹر صاحب، السّلام علیکم

قسمت نے ساتھ دیا اور انجمن کی زیارت پچھلے سال اگست میں ہو پائی۔ آپ کی زبانِ مبارک سے ملتے ہی دو ایک جملے ایسے سُننے میں آئے کہ برسوں کی دُوری دُور ہو گئی اور قُرب نے گھیر لیا، پہلے تو آپ نے یہ فرما کر زائر کا دل باغ باغ کر دیا کہ انجمن کے اندر باہر سے تمہاری وابستگیاں آج کے بیشتر کارکنوں کو کہاں نصیب ہیں۔ پھر جب رخصت ہونے کو اٹھا تو آپ نے فرمایا کہ تمہارا نام یعنی داؤد اختر شیرانی کے نام پہ رکھا گیا تھا، یہ سُن کر مسرت کے ساتھ حیرت بھی ہوئی کہ آپ کی واقفیت کیوں کر تہہ کو پہنچی،

اختر کے والد بزرگوار حافظ محمود خاں شیرانی اور والد مرحوم کا رشتۂ اتحاد ضرب المثل کا حکم رکھتا ہے جب شیرانی صاحب کا انتقال ہوا تو بابائے اردو نے والد صاحب کو لکھا کہ اردو کے شیرانی نمبر کے لیے مرحوم کی سیرت پہ ایک مضمون درکار ہے جو آپ اور صرف آپ لکھ سکتے ہیں، یہ مضمون لکھا گیا اور شیرانی نمبر میں چھپا، آپ نے ضرور پڑھا ہو گا۔

والد مرحوم کی ملازمت لاہور کے اورینٹل کالج میں ۱۹۲۲ء سے شروع ہوتی ہے، حافظ شیرانی مرحوم اسلامیہ کالج سے اورینٹل کالج کو ۱۹۲۸ء میں منتقل ہوئے، برسوں ایک ہی کالج میں دونوں مل جل کر رہے. بارہ سال ہفتہ وار معمول یہ رہا کہ تقریباً ہر سنیچر کو والد صاحب شیرانی صاحب کو موٹر سائیکل یا موٹر پہ اپنے ساتھ بٹھا کر موڈل ٹاؤن لے آتے، اتوار کی شام تک شیرانی صاحب یہیں رہتے. پھر شہر میں اپنے گھر کو لوٹ جاتے۔ اِدھر والد صاحب ہر جمعرات کو پچھلے پہر دو گھنٹے شیروانی صاحب کے ہاں فیلمنگ روڈ والے مکان پر گزارتے۔

لاہور سے حافظ شیرانی مرحوم کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۴۱ء میں ریٹائر ہوئے تو کُنبے کو ٹونک بھیج دیا اور خود موڈل ٹاؤن میں ہمارے ہاں آ مقیم ہوئے۔ گرمیوں کے تین مہینے (جون، جولائی اور اگست) انھوں نے یہاں گزارے۔ فردوسی پہ چار مقالے، تنقیدِ شعر العجم اور پرتھوی راج راسا۔ ان تینوں کتابوں کی پروف خوانی

انھوں نے یہیں موڈل ٹاؤن میں کی۔ اس شغل کے اوقات میں اکثر مجھے پاس بٹھایا کرتے۔ ٹونک سے برابر پیغام آ رہے تھے کہ متعلقین منتظر ہیں لیکن لاہور کو چھوڑنے کے خیال سے شیرانی صاحب پر وحشت سوار ہو جاتی تھی۔ آخر حکمتِ عملی سے والد صاحب نے ایک روز ان کو تانگے پر بٹھا کر رخصت کیا۔ شیرانی صاحب کی آنکھوں کی اُداسی اس وقت دیدنی تھی۔

حافظ صاحب کے حینِ حیات اختر ہمارے والد صاحب سے ملنے کبھی نہ آئے۔ جب باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو ایک روز اختر نے موڈل ٹاؤن کا رخ کیا پہلے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی صاحب کے ہاں پہنچے۔ ان کے ساتھ مل کر برسوں پہلے اختر نے رومان نام کا رسالہ نکالا تھا، عاشق صاحب نے اس ملاقات کا حال یوں لکھا ہے:

"چنانچہ وہ ایک دن ماڈل ٹاؤن میرے مکان پر تشریف لے ہی آئے۔ بوتل ان کی جیب میں تھی کچھ دیر بیٹھے پیتے رہے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بے حد تعجب ہوا کہ اب وہ شراب میں افیم بھی ملاتے تھے۔ میں نے پوچھا یہ بدعت کب سے شروع کی ہے۔ کہنے لگے فقط شراب سے نشہ نہیں ہوتا اس لیے افیم بھی ساتھ ملاتا ہوں۔ پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد یکایک کہنے لگے "اب زندگی سے اُکتا گیا ہوں۔ آپ نے بھی تو زندگی کا اُتار چڑھاؤ خوب دیکھ لیا ہے، چلیے اب آگے چلیں۔"

میں نے ہنس کر غالب کا یہ شعر پڑھ دیا:

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

شعر سن کر آبدیدہ ہو گئے اور پھر زار زار رونے لگے

یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔" *

عاشق صاحب سے ہمارے مکان کا پتا پوچھ کر وہاں سے پیدل چلے اور ہمارے ہاں پہنچے۔ اودرکوٹ کی جیب میں گردن دراز بوتل تھی۔ والد صاحب سے انھوں نے سگریٹ مانگا۔ میں اندر سے پیکٹ لے کر آیا۔ اجازت لے کر اختر نے سلگایا اور ساتھ ہی والد صاحب سے یہ کہا "آپ ہی نے مجھے سگریٹ پینا سکھایا تھا۔" میں اس تلمیح کے معنے نہیں سمجھا۔ آدھ گھنٹہ بیٹھے، زیادہ تو رویا کیے۔ بیچ میں متبسم ہو کر ذرا ہنسے بھی، بے ربط گفتگو کی، والد صاحب شروع سے آخر تک خاموش رہے۔ میں اس ملاقات کے دوران برابر حاضر رہا۔ جب چلنے کو اٹھے تو والد صاحب نے مجھ سے کہا "ان کو بس اسٹاپ تک پہنچا آؤ۔" میرے بازو میں بازو ڈال کر اختر چلے تو مجھ سے صرف اتنا کہا۔ "ہاں ہاں میں جانتا ہوں آپ کا نام بھی داؤد ہے۔ مگر میاں، وہ بات کہاں؟"

اختر شیرانی کی وفات کے حالات کی ایک تفصیل ایسی مجھ تک پہنچی ہے کہ اختر کے شیدائیوں کو اس کا علم ہونا چاہیے۔

---

* چند یادیں چند تاثرات، مکتبہ آئینۂ ادب، لاہور ۱۹۶۹ء

میرے بھائیوں میں سب سے بڑے ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب ہیں۔ کراچی کے میڈیکل ریسرچ سنٹر میں کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب کے ماتحت بہت دنوں پہلے ان کی ملازمت تھی۔ وہاں سے ریٹائر ہو کر امریکہ کی ایک یونیورسٹی کے میڈیکل کالج میں سولہ برس پروفیسر رہے۔ اب یہاں سے بھی ریٹائر ہو گئے ہیں اور امریکہ ہی میں مقیم ہیں۔

جن دنوں اختر کا انتقال ہوا ہے بھائی صاحب لاہور کے میڈیکل کالج میں اناٹومی (علم الابدان) پڑھانے پر مامور تھے۔ اناٹومی کے کورس میں انسانی بدن کے اعضا کی شناسائی بہم پہنچانے کو لاشیں مہیا کی جاتی ہیں۔ استاد آزمودہ طریق سے بتدریج چیر چیر کر گوشت، پوست، استخوان، رگ، ریشہ، دل، جگر، پتا، تلی، بھیجے، انتڑیوں، پٹھوں وغیرہ کی ساخت سمجھاتا ہے۔ اس کورس کی یہ ضرورت گمنام لاوارث لاشوں سے پوری ہوتی ہے۔ گمنام لاش پولیس لے کر آتی ہے۔ پہلے اس کا پوسٹ مارٹم معائنہ ہوتا ہے اس کے بعد لاش اناٹومی ڈیپارٹمنٹ کو پہنچائی جاتی ہے۔ وہاں اس پر ایک کیمیائی عمل کیا جاتا ہے جو لاش کو گلنے سڑنے سے بچا لیتا ہے۔

میو ہسپتال کے مُردہ خانے میں پوسٹ مارٹم کے فرائض گاہے گاہے بھائی اسحاق صاحب کے سپرد بھی ہوتے تھے۔ ایک روز ان کا ایک سدھایا ہوا ایک مددگار دوڑا دوڑا آیا اور بولا "ڈاکٹر صاحب ذرا میرے ساتھ چلیے ایک میت آپ کو دکھانی ہے۔" بھائی صاحب چکرائے کہ خدا خیر کرے۔ میت کے قریب پہنچے تو وہ مددگار بولا، غور سے دیکھیے، میرا تو خیال ہے یہ اختر شیرانی ہیں۔ بھائی صاحب نے سنبھل کر دیکھا تو یقین ہو گیا کہ یہ اختر ہی کی میت ہے۔ یہ مددگار اختر کا شیدائی تھا، بولا کہ فوراً اختر کے عزیزوں کو خبر پہنچائی جائے۔

لاش شہر میں کسی سڑک پر پائی گئی تھی۔ پولیس نے تانگے پر رکھ کر مردہ خانہ پہنچائی تھی۔

اناٹومی کے بڑے پروفیسر ڈاکٹر فخرالدین مرحوم تھے، بھائی صاحب ان کے ماتحت تھے۔ بھائی صاحب نے ان کو آگاہ کیا اور کہا کہ غضب ہے، ایسا نامی آدمی گمنام ہو کر یہاں پہنچا۔ اختر کے عزیزوں کو فوراً خبر کی جائے کہ آ کر جنازے کا انتظام کریں۔ ڈاکٹر فخرالدین نے فرمایا، اجی یہ شرابی تھا اس کی نظموں میں سوائے عشق کے اور کوئی مضمون نہیں ملتا، اس کی لاش کیمیائی جائے اور علم الابدان کی چیر پھاڑ کے لیے استعمال کی جائے۔ ایسوں کا یہی انجام ہونا چاہیے۔

بھائی صاحب نے کہا آپ صورت حال کی نزاکت کو نہیں سمجھے، جو میں کہتا ہوں وہی کیجیے ورنہ خیر نہیں۔ چناں چہ بھائی صاحب نے ٹونک میں وارثوں کو تار دیا، پچھلے دنوں میرے پھر پوچھنے پر بھائی صاحب نے بتایا کہ حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم کے بھانجے فضل الرحمٰن صاحب کو اطلاع دی گئی اور یہ کہ دونوں کے اندر اندر شیخوپورہ سے اختر کے چند اقارب میت کے لینے کو میو ہسپتال پہنچ گئے اور میت ان کو دے دی گئی۔

حکیم نیر واسطی نے اختر کی وفات کے بیان میں ان احوال کا کوئی ذکر نہیں کیا، یہ قصہ دل دوز ہے، ممکن ہے بعض سننے والے کہیں کہ چپ رہو، لیکن یہ قصہ اختر اور سلمیٰ کے معاملات کا اسطورہ نہیں، واقعہ ہے، بھائی صاحب کو کیا پڑی تھی کہ ایسا قصہ محض سنسنی کے لیے گھڑ کے ہم کو سناتے۔

اختر کی حساس دیوانگی سے متاثر ہو کر راقم نے یہ شعر کہا تھا ؎

رانجھے نے رکھی گاؤں کی، مجنوں نے صحراؤں کی شہروں کی بھی لاج رہی لیکن اختر شیرانی سے

غم آشنا

داؤد رہبر

۱۲ر فروری ۱۹۷۹ء

قبلہ ڈاکٹر صاحب السّلام علیکم

پرسوں ایک خط لکھا تھا۔ لیٹر بکس میں ڈالنے کو تھا کہ کچھ باتیں اور یاد آئیں۔ چناں چہ قلم اٹھایا۔ پہلا خط بھی اس خط کے ساتھ ہی منسوب ہے۔

چوبیس پچیس برس قبل ہماری زبان کے دو تین شماروں میں اوپر تلے ایک بحث نظر سے گزری۔ ایک صاحب نے ہماری زبان میں گمان پر مبنی ایک رائے کا اظہار کیا کہ علامہ اقبال نے مہاشے سدرشن کے ساتھ مل کر پنجاب کے اسکولوں کے لیے اردو نظم و نثر کے انتخاب کی کتابیں مرتب کیں۔ ہماری زبان کے یہ شمارے میرے ایک دوست ہربنس لال صاحب نے مجھے دکھائے۔ ایک شمارے میں ایک مختصر نوٹ سدرشن کاشمیری صاحب کا چھپا تھا۔ سدرشن صاحب نے اس اطلاع کی تردید یہ کہہ کر کی تھی کہ نصاب کی ان کتابوں کی ترتیب میں فطرت نگار سدرشن کے شریک علامہ اقبال نہ تھے بلکہ ان کے ہم نام پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (صدر شعبۂ فارسی پنجاب یونیورسٹی) تھے۔

پروفیسر اقبال مرحوم میرے والد تھے، اس تعلق کے حوالے سے ایک توضیح لکھ کر قومی زبان کو اشاعت کے لیے بھیج رہا ہوں۔

والد صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ ان نصابوں کی ترتیب میں شریکِ غالب سدرشن صاحب ہی تھے۔ والد صاحب نے انتخابات پر صرف سرسری نظر ڈالی تھی، ان کتابوں کے ناشر گلاب سنگھ اینڈ سنز تھے جن کا دفتر اورینٹل کالج کے قریب ہی تھا۔ والد صاحب کو اس سلسلۂ کتب کے نفع سے سالانہ رائلٹی کا ایک چیک ملتا تھا، آپ کالج سے پیدل چل کر ناشر کے ہاں چیک وصول کرنے تشریف لے جاتے۔ میں دو تین مرتبہ ان کے ہمراہ تھا و رچیک میرے سامنے وصول ہوئے۔

والسّلام

کرم کا طالب

داؤد رہبر

ڈاکٹر زینہ سعود

کیسری کشور

کئی برس ہوئے ایک دن میں اپنے مکان کے بیرونی کمرے میں نیم مُردہ سا لیٹا ہوا تھا کہ باہر موٹر رُکنے کی آواز آئی۔ پھر کمرے سے متصل برآمدے میں قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ میں رات سے بہت بیمار تھا اور اس وقت کسی ملاقاتی کے تصوّر نے مرض کی تکلیف کو اور بڑھا دیا۔ اسی وقت آنے والے نے ملتجی آواز سے پوچھا:

"کیا یہاں کوئی صاحب بیمار ہیں؟"

میں اس سوال پر غور کر رہا تھا کہ کھلے ہوئے دروازے سے مجھے لیٹا دیکھ کر وہ صاحب ہاتھ میں بیگ لیے ہوئے کمرے کے اندر آ گئے۔ بیگ سے اسٹتھوسکوپ نکال کر میرا معائنہ کیا، حال پوچھا، کچھ دوائیں اپنے پاس سے دیں، کچھ کے نام پرچے پر لکھے اور ضروری ہدایتیں دیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے دبی زبان سے فیس کو پوچھا تو ہاتھ جوڑ کر انکار کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"مجھے ڈاکٹر کیسری کشور نے بھیجا ہے" اور فیس لیے بغیر واپس چلے گئے۔

میں نے ان کے دیے ہوئے پرچے پر نظر ڈالی تو پتا چلا کہ وہ شہر کے ایک بہت ممتاز ڈاکٹر تھے۔ مجھے یاد آگیا کہ سویرے ڈاکٹر کیسری کشور نے مجھ کو فون کیا تھا تو انھیں بتایا گیا تھا کہ میں بیمار اور فون تک آنے سے معذور ہوں۔

ڈاکٹر کشور کو میں نے اوّل اوّل لکھنؤ یونیورسٹی کے اسٹاف کلب میں دیکھا تھا جہاں وہ کبھی کبھار آنکلتے تھے۔ میرا ان سے ذاتی تعارف نہیں تھا لیکن اپنے ساتھیوں سے مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ میڈیکل کالج میں پڑھاتے ہیں۔ اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے لیکن اردو شاعری کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں، اور کلامِ غالب کے حافظ ہیں۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ وہ خود بھی شعر کہنے لگے ہیں۔ پھر ایک دو مشاعروں میں ان کا کلام سننے کا موقع بھی ملا۔ اسی دوران پروفیسر ولی الحق انصاری صاحب کے یہاں ایک شعری نشست میں ان سے ملاقات ہوئی اور مجھے دیکھتے ہی انھوں نے قریب آکر کہا:

"کیوں جی، سنا تم ہمارے کلام کی تعریف کرتے ہو؟"

میں نے ان کے بھاری بھرکم بدن اور رعب دار چہرے کو ایک نظر دیکھا اور آہستہ سے پوچھا:

"یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟"

"ولی ... رہے تھے" انھوں نے جواب دیا اور گواہی کے لیے ولی الحق صاحب کو آواز دی۔ میں نے کہا:

"کلام زور دار ہوگا تو تعریف کرنا ہی پڑے گی"

"زور دار کلام سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

لیکن میرے جواب دینے سے پہلے نشست کا آغاز ہوگیا۔ اس نشست میں ڈاکٹر کشور نے اپنی تازہ غزل سنائی پھر میرے پاس بیٹھ کر چپکے سے پوچھا:

"کہو بھئی، ہماری غزل کیسی رہی؟"

"زور دار" میں نے کہا۔

"پھر وہی" انھوں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ "آخر زور دار کا مطلب کیا ہے؟"

اب مجھے یاد نہیں کہ میں نے جواب میں کیا کہا تھا لیکن اس نشست کے بعد ان سے اکثر ملاقات ہونے لگی۔ میڈیکل کالج لکھنؤ کے فارماکولوجی ڈیپارٹمنٹ کی تجربہ گاہ کے ایک سرے پر ان کا کمرہ تھا۔ تجربہ گاہ کی پُرکشش فضا سے اس کمرے میں پہنچ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ریگستان کا مسافر نخلستان میں پہنچ گیا۔ سامنے کرسی پر ڈاکٹر کیسری کشور لطائف و ظرائف کے پھول بکھیرتے اور اشعار آب دار کے موتی رولتے نظر آتے۔ بھانت بھانت کے لوگ ان کے پاس آتے رہتے تھے کسی کو اپنے رشتہ دار کا آپریشن کرانا ہے تو کوئی خود اپنا معائنہ کرانا چاہتا ہے، کوئی اسپیشل وارڈ کا جویا ہے تو کسی کو بیش قیمت دوائیں بلا قیمت مطلوب ہیں۔ اور ڈاکٹر کشور اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے سب کی مشکلیں حل کر دیا کرتے تھے۔ ادبی گفتگوؤں اور شعر خوانی کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ بیچ بیچ میں ایسا بھی ہوتا کہ تجربہ گاہ سے ان کا کوئی شاگرد ہاتھ میں کسی کیمیائی مرکب کی شیشی لیے کمرے میں داخل ہوتا اور کہتا:

"سر، یہ DILUTE نہیں ہو رہا ہے"

اور ڈاکٹر کی زبان پر "ایہام"، "تنسیق الصّفات"، "پیکر تراشی" وغیرہ کی جگہ علم الادویہ کی ادق لاطینی اصطلاحیں رواں ہو جاتیں شاگرد مطمئن ہو کر باہر چلا جاتا اور ڈاکٹر امانت لکھنوی کا کوئی مزے دار شعر سنا کر بچوں کی طرح ہنسنے لگتے۔ ان کی ہنسی میں معصومیت اور شوخی کا عجیب امتزاج ہوتا تھا۔ جب بھی وہ کسی مشاعرے میں کامیاب غزل پڑھ کر ڈائس سے نیچے اترتے تھے تو اس طرح ہنستے تھے جیسے شریر بچہ کوئی نئی شرارت کر کے ہنستا ہے۔ ایک بار میں نے کہا بھی:

"ڈاکٹر صاحب، آپ کی اس ہنسی سے گمان ہونے لگتا ہے کہ آپ کسی دوسرے کا کلام اس کی لاعلمی میں اپنے نام سے پڑھ دیتے ہیں۔"

"تو امتحان لے لو نا" انھوں نے کہا۔ "لاؤ نکالو کوئی طرح"

میں نے ایک مشکل طرح نکالی اور انھوں نے مشاعرہ گاہ سے نکلتے نکلتے اس طرح میں کئی اچھے شعر کہہ دیے۔

جب ڈاکٹر کیسری کشور کو اتر پردیش اردو اکادمی کی مجلس عاملہ کا ممبر نامزد کیا گیا تو بعض حلقوں میں ایک غیر اردو داں کی نامزدگی پر چہ میگوئیاں ہوئی تھیں۔ اسی زمانے میں ایک دن میں نے ان سے پوچھا:

"ڈاکٹر صاحب، کیا یہ واقعہ ہے کہ آپ اردو لکھ پڑھ نہیں سکتے یا آپ نے مصلحتاً ایک غلط بات کو شہرت......"

"نہیں بھئی"، وہ بولے، "میں نے کسی سے یہ نہیں کہا۔ دراصل میں نے اردو ادب کا سارا مطالعہ ہندی میں کیا ہے۔ تم لوگوں کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ ہندی میں اردو کا کتنا سرمایہ منتقل ہو چکا ہے۔ اردو پڑھ لیتا ہوں مگر ہندی کے مقابلے میں دیر لگتی ہے۔ اردو لکھ بھی سکتا ہوں لیکن مشکل سے"۔ پھر وہ اسی بچکانہ شوخی کے ساتھ مسکرا کر بولے "میں تو اس لیے خاموش ہوں کہ کوئی مورچلا میرا نام لے کر اخبار میں یہ بات لکھ دے کہ میں اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا، تو میں اس پر ہتکِ عزت کا مقدمہ دائر کر دوں اور عدالت میں جج کے سامنے اردو لکھ اور پڑھ کر تاوان وصول کروں اور اس رقم سے تم لوگوں کی دعوت کروں"۔

"دعوت تو اس غریب مدعا علیہ کو ذبح کیے بغیر بھی ہو سکتی ہے"۔

"چلو یہی سہی، اب کی اتوار کو آؤ"۔ انھوں نے کہا۔ "البتہ اس مال کی دعوت میں تمہیں اپنے ہاتھ کا پکا ہوا مرغ مسلّم کھلاتا"۔

"مرغ مسلّم پکانا مذاق نہیں ہے"۔

"میاں، لکھنؤ کے کسی بھی باورچی سے مقابلہ کرالو"۔ انھوں نے بڑے دعوے کے ساتھ کہا۔

اور یہ واقعہ ہے کہ وہ کھانا پکانے کے ماہر تھے اور اسی کے ساتھ کھانے کھلانے کے شوقین بھی۔ ریور بینک کالونی میں بیلی گارد (لکھنؤ ریذیڈنسی) کی چار دیواری سے متصل ان کے مکان میں ہم لوگوں نے بارہا ان کے ہاتھ کے پکوانوں کا مزا لیا ہے۔

اس زمانے میں ڈاکٹر کشور کی طبیعت آمد پر تھی۔ خوب خوب شعر کہہ رہے تھے۔ شمس الرحمٰن فاروقی بھی لکھنؤ ہی میں تعینات تھے۔ دونوں کی ملاقات کرائی۔ آناً فاناً دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہو گئے۔ ڈاکٹر نے پوچھا:

"کیا یہ سچ ہے کہ تم تنقید میں رو رعایت سے کام نہیں لیتے؟"

"کوشش تو کرتا ہوں"۔ فاروقی نے کہا۔ "آپ کچھ سنائیے"۔

ڈاکٹر نے کچھ سنایا۔ فاروقی بولے۔

"کلام تو زوردار ہے، لیکن ......"

"... الفاظِ دقیق و غریب کا وفور ہے"۔ میں نے جملہ پورا کیا۔

"تو اس میں حرج کیا ہے؟" ڈاکٹر میری طرف پلٹ پڑے۔

"کچھ نہیں"۔

"واہ۔ فاروقی، تم بولو"۔

"مجھے تو الفاظِ دقیق و غریب کا استعمال پسند ہے۔ بہ شرطیکہ سلیقے کے ساتھ ہو"۔

"اب آپ فرمائیے"۔ وہ مجھ سے بولے:

"شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں"۔

اس کے بعد جب فاروقی سے ملاقات ہوتی، استعمالِ الفاظ پر بحث ضرور ہوتی۔ ایک دن فاروقی نے کہا:

"اصل میں آپ نے ہندی حرفوں میں اردو پڑھی ہے اس لیے اردو لفظوں کا مزاج آپ ٹھیک سے نہیں پہچانتے"۔

"یہ کیا بات ہوئی؟"

دیر تک بحث رہی۔ ڈاکٹر قائل نہیں ہوئے۔ لیکن دوسرے دن صبح صبح انھوں نے مجھے فون کیا:

"کل فاروقی مذاق کر رہے تھے یا سیریس تھے؟"

"مذاق غالباً نہیں کر رہے تھے۔"

"تم دونوں کی کوئی سازش تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

"اچھا تو آج یونیورسٹی جاتے ہوئے مجھے میر انیس کے مرثیے دیتے جانا۔"

میں نے اسی دن "روحِ انیس" ان کے حوالے کی۔ شام کو پھر فون آیا:

"لے ستمگر، جو نہ جاتا تھا تو اب جاتا ہوں!"

"خدا حافظ، جہاں جائیے خوش رہیے۔"

"مذاق نہیں۔ کیا بہادری ٹپکتی ہے:"

ہاں سونے ابنِ شہنشاہِ عرب جاتا ہوں لے ستمگر جو نہ جاتا تھا تو اب جاتا ہوں

اگلے تین چار دن میں انھیں میر انیس کا مرثیہ "بہ خدا فارسِ میدانِ تہور تھا حُر" بیشتر حفظ ہو چکا تھا اور حُر کی زبان سے یہ مصرع "لے ستمگر جو نہ جاتا تھا....." وہ قریب قریب ہر ملنے والے کو سنا چکے تھے۔ پانچویں چھٹے دن پھر فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر اپنا فون نمبر بتایا۔ اُدھر سے آواز آئی:

"حقاکہ افصح الفصحا ہے انھیں کا جد"

"اچھا اچھا، "جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے" زیرِ مطالعہ ہے؟"

"یار، اس 'افصح الفصحا' کا کوئی جواب ہے؟ بھئی مزہ آگیا۔ اور تم لوگ مجھے گاڑھی زبان کا طعنہ دیتے ہو!"

"شرط سلیقہ ہے۔ اس سے بھی گاڑھی زبان ملاحظہ فرمایئے۔ گدا علی گدا کہتے ہیں۔...."

"ارشاد"

"امامِ تشنہ جگر نے پس از نمازِ عشا بہن کے سر کو لگا چھاتی سے رو رو کہا

کہ اے حبیبۂ امّ الائمۃ الحسنا ....."

"کیا؟ ٹھہرو ٹھہرو۔ کہ اے حبیبۂ.....؟"

"کہ اے حبیبۂ امّ الائمۃ الحسنا"

"مر گئے۔ ایک منٹ۔ ارے سُدھا! انھوں نے فون ہی پر اپنی بیگم کو زور سے پکارا۔ کچھ دیر تک ان سے کچھ کہتے رہے۔ پھر مجھ سے بولے۔ "ہاں، اب سناؤ۔"

میں نے مصرع دُہرا کر اگلا مصرع پڑھا:

"ترے بلکنے سے تن کانپتے ہیں ارض و سما"

"ایک منٹ، ایک منٹ۔ کہ اے ۔ ۔ ۔ ۔ حبیبۂ ۔ ۔ ۔ ۔ اُمُّل ۔ ۔ ۔ ۔ آگئے ؟"

میں نے آگے بول کر پوچھا :

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟"

"کچھ نہیں۔ نوٹ کہہ رہا تھا۔"

"ہندی میں ؟"

"ہاں۔ مگر یار ہندی میں لکھا ہوا کچھ عجیب سا معلوم ہو رہا ہے۔ اچھا میں شام کو آرہا ہوں۔ مجھے اردو میں لکھ دینا اور معنی بھی لکھ دینا۔ مگر بھئی مزہ آگیا۔ کہ اے حبیبۂ امّ الائمۃ الحسنا۔ یہ گدا بھی بڑا ظالم آدمی تھا۔ یار شام کو تمہیں نہ آجاؤ؟ اپنے ہاتھ کے پکوڑے کھلاؤں گا۔"

"پکوڑے ؟" میں نے کہا۔ "لاحول ولاقوۃ۔ اس ٹھاٹھ کا مصرع اور اس کے انعام میں پکوڑے !"

"اور نہیں تو کیا آپ کے لیے دربہشت، راحتِ جاں اور لقمی میانہ پُرخاصگی تیار کروں ؟ اماں ایک بار ہم ایک نواب صاحب کے یہاں دعوت کھانے پہنچ گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس کے بعد وہ دیر تک مسلّم پکوانوں کے شاعرانہ نام گناتے رہے۔ فون رکھ دیا، ذرا ہی دیر بعد پھر ملایا :

"یار، اردو میں ائمۃ الحسنا کس طرح لکھا جائے گا ؟"

ڈاکٹر کے فون زیادہ تر اسی ڈرامائی انداز میں آتے تھے۔ ایک دن گھنٹی بجی میں نے رسیور اٹھایا۔ آواز آئی :

"بڑھ گئی بڑھ گئی !"

"کچھ اور بتائیے کب بڑھی، کتنی بڑھی، کیوں کر بڑھی ؟ اور مناسب سمجھیے تو یہ بھی بتائیے کہ کیا بڑھی۔"

"اماں ریڈیو اسٹیشن سے آرہا ہوں۔ فاروقی بیٹا کو بھی بتا دینا۔"

معاملہ میری سمجھ میں آگیا۔ تین چار دن پہلے میرے یہاں فاروقی اور ڈاکٹر بیٹھے ہوئے تھے۔ ریڈیو پروگراموں کی فیس کا ذکر نکل آیا۔ معلوم ہوا ڈاکٹر کی فیس سب سے کم ہے۔ ہم لوگوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا تو بولے :

"بات یہ ہے کہ تم لوگ بہت پہلے سے پروگرام دے رہے ہو۔ میں تو ابھی میدان میں آیا ہوں۔"

اس کے بعد ایک ادبی مسئلے پر بحث چھڑ گئی۔ ڈاکٹر نے اپنی کچھ رائے ظاہر کی تو میں نے روکھا لہجہ بنا کر کہہ دیا :

"جب دو سینیئر براڈکاسٹر بات کر رہے ہوں تو جونیئر لوگوں کو بیچ میں نہیں بولنا چاہیے۔"

"اچھا استاد اچھا دیکھوں گا۔"

یہ سیاق و سباق یاد آگیا تو میں نے پوچھا :

"یعنی آپ نے اپنی فیس بڑھوالی ؟"

"کیا سمجھتے ہو ؟ آج میں ریڈیو اسٹیشن گیا اور دندناتا ہوا ڈائرکٹر کے کمرے میں ۔ ۔ ۔ اپنے کو انگریزی میں انٹروڈیوس کرایا اور صاف صاف کہہ دیا کہ آپ لوگوں نے میری فیس اتنی کم رکھی ہے کہ کل کے لڑکے مجھے لونڈا سمجھتے ہیں۔ یا تو فیس بڑھائیے یا میرا نام

اپنے یہاں سے کاٹ دیجیے۔ بس، بڑھ گئی۔"

اپنا مجموعۂ کلام "ہنوز شیشۂ گراں" ڈاکٹر نے بڑے چاؤ سے تیار کیا تھا۔ کتابت شروع کرنے سے پہلے مسودہ مجھے دے کر انھوں نے کہا:

"اسے ایک بار پھر دیکھ لو، اور حشو کہیں بھی ہو، فوراً بتاؤ۔"

مختصر مجموعہ تھا۔ میں نے اسی وقت ورق گردانی کی اور کہا:

"یہ جو شعر ہے: نذرِ آتش آؤ کر دیں ہم بھی ماضی کے خطوط لان پر مالی جلا دیتے ہیں سوکھی پتیاں

اس میں "لان پر" کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ اس کے بغیر بھی مضمون پورا ہے۔"

"لان پر مالی...... ہاں، یہ بات تو ہے۔ پھر اسے ہٹا کر فاعلن کے وزن کا کوئی اور لفظ رکھا جائے۔"

"جب مضمون پورا ہے تو جو لفظ بھی رکھیے گا، وہ حشو ہوگا۔"

"واہ، آخر حشوِ ملیح بھی تو کوئی چیز ہے۔"

"آپ ملیح اور قبیح کے جھگڑے میں کیوں پڑیے۔ ایسا کیجیے کہ "لان پر" کی جگہ "فاعلن" ہی رکھ دیجیے۔"

"یعنی، فاعلن مالی جلا دیتے ہیں......؟"

"جی ہاں، اور اس پر حاشیہ لکھ دیجیے کہ مضمون پورا ہوگیا تھا مگر ایک رکن کم پڑ رہا تھا۔ مناسب سمجھا گیا کہ بھرتی کے کسی لفظ سے یہ کمی پوری کرنے کے بجائے وہی رکن رکھ دیا جائے جو کم پڑ رہا تھا۔"

خوب ہنسے اور رشام کو فون کیا:

"مسودہ کتابت کو دے رہا ہوں۔ وہ مصرع یوں ہی کر دیا ہے۔" فاعلن مالی جلا دیتے ہیں سوکھی پتیاں

"حاشیے کی عبارت سن لو۔"

"یعنی آپ سنجیدگی سے میری تجویز......"

"کیا حرج ہے؟ بات بالکل معقول ہے۔ اماں مزہ آئے گا۔"

"ایسا غضب نہ کیجیے گا۔"

بڑی مشکل سے راضی ہوئے اور وہ مصرع "لان پر" ہی کے ساتھ چھپا۔

اکتوبر ۱۹۷۸ء میں "ہنوز شیشۂ گراں" کی اشاعت ہوئی، لیکن اس کی [illegible] طباعت ڈاکٹر کے حسب منشا نہیں تھی لہٰذا انھوں نے اس پورے ایڈیشن کو مسترد کر دیا اور نئے سرے سے کتابت کرا کے دسمبر [illegible] میں دوسرا ایڈیشن شائع کیا اور یوپی اردو اکادمی کی طرف سے اس پر انعام حاصل کیا۔ انھوں نے خاص خاص احباب سے اس پر تبصرہ لکھنے کی بھی فرمائش کی مگر سب نے قریب قریب ایک ہی جواب دیا کہ ایسی جلدی کیا ہے۔

اسی دوران ایک دن اطلاع ملی کہ ڈاکٹر کیسری کشور پر سخت قلبی دورہ پڑا ہے اور وہ میڈیکل کالج کے شدید نگرانی والے وارڈ میں داخل کر دیے گئے ہیں۔ میں انھیں دیکھنے پہنچا۔ صرف ایک منٹ تک ان کے پاس کھڑے ہونے کی اجازت ملی۔ وہ مختلف آلات میں جکڑے ہوئے پڑے تھے۔ میں چپ چاپ انھیں دیکھ رہا تھا کہ ان کی آنکھیں ذرا سی کھلیں۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے اشارے سے پاس بلایا اور جب میں

اپا کان ان کے منھ کے قریب لے گیا تو نہایت نحیف آواز میں بولے:

"رفتہ رفتہ وہ رفعت پا ئی جاں پہ گرفتِ سمت نہیں"

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ پھر بولے:

"دوسرا مصرع سنو"

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، اور بولا: "ہرگز نہیں سنوں گا۔ آپ نے بھی انتہا کر دی، اس وقت شعر و شاعری ....."

"سنو تو،" وہ بولے۔ "بھائی میں اس دورے میں آدھے سے زیادہ مر گیا تھا۔ جب ایمبولنس میں اسپتال لایا جا رہا تھا تو ذرا دیر کو ہوش آیا۔ میں نے سوچا کہ ختم ہو رہا ہوں، چلتے چلتے ایک مطلع تو ٹھونک ہی دیا جائے۔ لو، اب دوسرا مصرع سنو"

لیکن دوسرے مصرعے سے پہلے ہی دوسرا منٹ شروع اور ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔

اسپتال میں کچھ عرصے تک زیرِ علاج رہنے کے بعد ڈاکٹر ٹھیک ہو کر گھر آ گئے۔ معالجوں سے وعدہ کر کے آئے تھے کہ گھر پہنچ کر ایک ہفتے تک کسی سے نہیں ملیں گے لیکن پہلے ہی دن ان کا فون آیا:

"بھائی، گھر آ گیا ہوں تمہیں فرصت ہو تو آ جاؤ۔"

"یہ وعدہ خلافی؟"

"نہیں یار، خود کچھ نہیں بولوں گا۔"

"جی معاف کیجیے۔ یک طرفہ گفتگو میرے بس کی بات نہیں۔"

"سنو تو۔ ایک دفعہ تم نے ذکر کیا تھا، کوئی دعا ہے شاید، وہی جس کی عبارت کا بہاؤ ..... ارے وہی تم شبِ قدر میں پڑھتے ہو"

"اچھا، جوشنِ کبیر؟"

"جوشنِ کبیر، ہاں۔ اگر فرصت ہو تو آ کر مجھے سناؤ۔"

"مگر وہ بہت لمبی دعا ہے۔"

"تو کیا ہوا؟ آہستہ آہستہ پڑھتے جانا۔ میں چپ چاپ پڑا سنتا رہوں گا۔"

"اچھا تو دو تین دن آرام کر لیجیے، پھر....."

"نہیں یار، چلے ہی آؤ۔"

تھوڑی دیر بعد وہ بڑی یکسوئی کے ساتھ آنکھیں بند کیے سن رہے تھے:

"یَا مَنْ هُوَ فِیْ عَهْدِهٖ وَفِیٌّ، یَا مَنْ هُوَ فِیْ وَفَائِهٖ قَوِیٌّ، یَا مَنْ هُوَ فِیْ قُوَّتِهٖ عَلِیٌّ، یَا مَنْ هُوَ فِیْ عُلُوِّهٖ قَرِیْبٌ، یَا مَنْ هُوَ فِیْ قُرْبِهٖ لَطِیْفٌ، یَا مَنْ هُوَ لُطْفِهٖ شَرِیْفٌ، یَا مَنْ هُوَ فِیْ شَرَفِهٖ عَزِیْزٌ، یَا مَنْ هُوَ فِیْ عِزِّهٖ عَظِیْمٌ، یَا مَنْ هُوَ فِیْ عَظَمَتِهٖ مَجِیْدٌ، یَا مَنْ هُوَ فِیْ مَجْدِهٖ حَمِیْدٌ ۝ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِاسْمِكَ یَا كَافِیْ یَا شَافِیْ، یَا وَافِیْ، یَا مُعَافِیْ، یَا هَادِیْ، یَا دَاعِیْ، یَا قَاضِیْ، یَا رَاضِیْ یَا عَالِیْ، یَا بَاقِیْ....."

دعا ختم ہوئی تو بولے:

"اسے ریکارڈ کر کے مجھے دینا، پھر کچھ دن میں مجھ سے زبانی سن لینا۔"

ڈاکٹر کی بیماری کے دوران ان کی والدہ انھیں دیکھنے کے لیے الہ آباد سے لکھنؤ آ گئی تھیں لیکن یہاں آ کر وہ خود بستر سے لگ گئیں اور کئی مہینے علالت کے بعد یہیں ان کی وفات ہوگئی۔ ماں کی شب و روز تیمارداری کی تکان پھر ان کی موت کے صدمے نے ڈاکٹر پہ بُرا اثر کیا۔ کچھ دن بعد ان پر پھر قلبی دورہ پڑا۔ اور اگرچہ اسپتال سے چھٹی پانے کے بعد انھوں نے زبان سے کبھی مایوسی کا ایک لفظ بھی نہیں نکالا لیکن اس دوسرے دورے کے بعد میں نے انھیں مسکراتے نہیں دیکھا۔

۲۲ جون کی صبح ان کا فون آیا:

"میں کیسری کشور بول رہا ہوں۔"

"آداب عرض۔ آپ کیسے ہیں؟"

"ٹھیک۔ فون اس لیے کیا ہے کہ میں اردو اکیڈمی کے انعام کی رقم واپس کر رہا ہوں۔ تمہارے یہاں "ہنوز شیشہ گراں" کی جو کاپیاں رکھوائی ہیں انھیں تلف کر دینا اور عابد سہیل نے اس پر تبصرہ لکھنے کا وعدہ کیا ہے انھیں روک دینا۔"

"یہ آپ کو کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں، وہ کتاب اس قابل نہیں کہ لوگ اس پر رائے ظاہر کر کے اپنا وقت برباد کریں۔"

"اچھا میں آ رہا ہوں۔"

"کیا کرو گے۔ ایک روتے ہوئے بیمار آدمی سے مل کر . . . ."

"اچھا ٹھیک ہے، آپ بھابھی کو فون دیجیے۔"

"ہاں ان سے بھی بات کر لو۔" اور انھوں نے کمزور آواز میں پکارا، "سُدھا!"

ان کی بیگم نے رسیور لیا تو میں نے پوچھا:

"یہ کیا حال ہے؟ کیا وہ واقعی رو رہے ہیں؟"

"ہاں بھیا، دو تین دن سے انھیں پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔"

"میں آ جاؤں؟"

"آ جائیے تو اچھا ہے۔"

ریور بینک کالونی پہنچا۔ پوچھا:

"آج آپ یہ کیسی باتیں کر رہے تھے؟"

وہ دیر تک خاموش رہے پھر بولے:

"کچھ نہیں۔ اطہر نبی کل بمبئی جا رہے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ اگر تبصرہ مل جائے تو وہ اردو بلٹز میں فوراً چھپوا سکتے ہیں۔"

"تو میں انھیں تبصرہ لکھ کر دیے دیتا ہوں۔"

"جی چاہے تو دے دو۔"

میں اس گھر میں جاتا تھا تو ڈاکٹر دور ہی سے شور مچاتے ہوئے ملاقاتی کمرے میں داخل ہوتے تھے۔ لیکن اس وقت مجھے ان کی آواز بہ مشکل سنائی دے رہی تھی۔ میں ان سے یہ کہہ کر چلا آیا کہ شام کو اطہر نبی کسی کو میرے یہاں بھیج کر تبصرہ منگوا لیں۔ دن کو میں نے تبصرہ لکھ کر شام کو آدمی کے حوالے کر دیا۔

۸ر جولائی (۱۹۷۹ء) کو ان کا فون آیا:

"بلٹز آگیا ہے۔" انھوں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تبصرہ چھپ گیا؟"

"ہاں، تم نے تو ہماری بڑی تعریف کر دی ہے۔"

"کلام زوردار ہوگا تو تعریف کرنا ہی پڑے گی۔"

بہت دیر تک خاموش رہنے کے بعد وہ بولے:

"بڑی سخت گرمی پڑ رہی ہے، مگر بارش کے آثار ہیں۔ پانی برستے ہی مجھ سے ملنے آنا۔"

دوسرے دن میں باہر سے اپنے گھر میں داخل ہوا تو چھوٹے بھائی نے پوچھا:

"آپ ڈاکٹر کشور کے یہاں گئے تھے؟"

"نہیں، کل یا پرسوں جاؤں گا۔"

"ان کے یہاں سے فون آیا تھا۔ وہ ختم ہو گئے۔"

جب میں ولی الحق صاحب کے ساتھ گومتی کے گھاٹ پر پہنچا تو چتا کو آگ دی جا چکی تھی اور اس کے اوپر شمشان کی چھت کا ٹین شعلوں سے تپ کر سرخ ہونے کے قریب تھا۔

بابائے اردو یادگاری لکچر ۱۹۸۰ء

محمد تقی میر

از

ڈاکٹر جمیل جالبی

قیمت: ۲۵ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

محمد علی صدّیقی

اردو کا پہلا ناول

ڈپٹی نذیر احمد کو بالعموم اردو ناول کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ یہ خیال بہت زیادہ غلط بھی نہیں۔ اردو ادب کے مورخین ڈپٹی صاحب کے ناول "مرۃ العروس" مطبوعہ (۱۸۶۹ء) کو اردو کا پہلا ناول قرار دینے پر متفق نظر آتے ہیں۔ "بنات النعش" اسی ناول کا دوسرا حصہ ہے اور اسی وجہ سے اردو ناول کی تاریخ میں دوسرا ناول بھی قرار پاتا ہے۔

ان ناولوں کی تصنیف سے بیشتر رجب علی بیگ سرور نے "شمشیر خانی" کے قصہ کا ترجمہ "سرور سلطانی" (مطبوعہ ۱۸۴۷ء) کے نام سے کیا تھا۔ "شرح عشق" نواب سکندر بیگم والیٔ بھوپال کے حکم سے تصنیف ہوا۔ اور ۱۸۵۶ء میں "شگوفۂ محبت" نامی قصہ کی شکل میں سامنے آیا تھا۔

۱۸۳۵ء میں سرکاری زبان کی حیثیت سے فارسی کی موقوفی کے بعد اردو زبان میں قصے کہانیاں تحریر کرنے کے رجحان میں اضافہ ہوا۔ منشی شمس الدین نے "حکایات الجلیلہ" کے عنوان سے ۱۸۳۶ء میں الف لیلہ کی دو سو کہانیوں پر مشتمل ایک کتاب شائع کی۔ ۱۸۴۴ء میں منشی عبدالکریم نے فارسٹر کی "الف لیلہ" کا ترجمہ کیا۔ نول کشور نے ۶۸-۱۸۶۲ء میں چار جلدوں میں الف لیلہ کا منظوم ترجمہ شائع کیا اور مرزا حیرت دہلوی نے اس قصہ کو ناول کی شکل میں ڈھالا تھا۔ علاوہ ازیں مولوی کریم الدین پانی پتی نے ۱۸۶۴ء میں "خط تقدیر" کے نام سے ایک ناول نما قصہ تحریر کیا تھا جو پنجاب میں داخل نصاب ہوا۔ گورکھپور یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمود الٰہی اسی قصہ کو اردو کا پہلا ناول قرار دیتے ہیں اور اس طرح ڈپٹی نذیر احمد کا اردو کے پہلے ناول نگار ہونے کا اعزاز خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔

اگر ہم "خط تقدیر" کو پہلا اردو ناول تسلیم بھی نہ کریں تب بھی ایک ایسا ترجمہ سامنے آیا ہے جسے بہ آسانی اردو کا پہلا ناول یا پھر اردو کے پہلے ناول کا "مثالی نمونہ" قرار دیا جا سکتا ہے۔ "خط تقدیر" کے بارے میں کہا گیا تھا کہ یہ ایک تمثیلی داستان ہے۔ اگر ڈاکٹر محمود الٰہی اس تمثیلی داستان کو اردو کا پہلا ناول قرار دیتے ہیں تو پھر "سرور سلطانی" (مطبوعہ ۱۸۴۷ء) اس اعزاز کا زیادہ مستحق ہے۔ لیکن میرے خیال میں "مسیحی مسافر کا احوال" (مطبوعہ ۱۸۶۹ء) اردو ناول نگاری کی تاریخ میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ ناول جان بنین (JOHN BUNYAN) کے شہرہ آفاق تمثیلی قصے THE PILGRIMS PROGRESS کا ترجمہ ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کا ناول "مراۃ العروس" کرداروں کے ناموں کے طرز پر اسی ترجمہ کو پیش نظر رکھ کر تصنیف کیا گیا ہے۔ یقینی طور پر ڈپٹی نذیر احمد نے اس ترجمہ کا مطالعہ کیا ہو گا۔ وہ بہت سی انگریزی تصنیفات کے مترجم ہیں۔ اس میدان میں اہم فرد ہونے کے ناتے ان کی نظر سے جان بنین کی

کتاب THE PILGRIM'S PROGRESS کا ترجمہ ضرور گذرا ہوگا۔ جون بنین کی کتاب باقاعدہ تاول کی صف میں نہیں آتی لیکن اس قصہ کے کردار بھی اسم بامسمیٰ ہیں اور ان صفات سے متصف ہیں جو ان کے کردار کا تعین کرتی ہیں۔ یہ کتاب ۸۰۹ء میں پنجاب ریلیجیس بک سوسائٹی انارکلی لاہور نے شائع کی تھی اور میرے پاس اس کتاب کا ایک نادر نسخہ موجود ہے۔ "مسیحی مسافر کا حوال" کے مترجم کا اصل نام معلوم نہ ہوسکا "مترجم" ہی بطور نام کے استعمال ہوا ہے۔ جون بنین نے اپنے کرداروں کے لیے ڈائیلاگ کی فارم استعمال نہیں کی ہے۔ بیانیہ میں کردار داخل ہوتے ہیں اور پھر باہر چلے جاتے ہیں۔ بس یہ ہے کہ اسم بامسمیٰ ناموں کے لفظ کا پہلا حرف جلی رکھ دیا ہے تاکہ وہ اسم نکرہ نہ معلوم ہوسکے "مراۃ العروس" میں بالکل ڈرامہ کے انداز میں کردار آتے ہیں اور ہر مکالمہ سے پہلے کردار کا نام دیا گیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اردو ڈرامہ کے انداز میں کرداروں سے کام لیا ہے۔ اس دور میں "اندر سبھا" کی بیاضیں موجود تھیں۔ نگریزی ڈرامے بھی ڈپٹی نذیر احمد کی توجہ کا مرکز بنے ہوں گے۔

"مسیحی مسافر کا احوال" انگریزی زبان میں بعنوان THE PILGRIM'S PROGRESS ۱۶۷۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ انجیل کے بعد شاید ہی کوئی انگریزی کتاب اس درجہ مقبول ہوئی ہو۔ دنیا میں اس ڈھنگ اور پائے کی شاید ہی کوئی اور کتاب ہو۔ اس کتاب کے اردو مترجم کا خیال ہے کہ اس کتاب میں شروع سے آخر تک تشبیہوں اور استعاروں میں بڑے بڑے روحانی راز بیان کیے گئے ہیں۔ ایمان لانے کے دن سے حلال میں داخل ہونے تک مسیحی کے ہر ایک قسم کے تجربے کا بیان انتہائی سادگی سے کیا گیا ہے۔ تاہم روحانی رازوں سے یہ کتاب سراسر شرابور ہے جس سے اعلیٰ درجے کی دینداری اور دماغی قوت کا نشان ملتا ہے۔

ظاہر ہے کہ بہ حیثیت ایک عیسائی مترجم نے اس کتاب کے بنیادی سبق کی طرف اشارہ کیا، وہ سبق کیا ہے؟ زندگی، زندگی، ہمیشہ کی زندگی۔ منزلِ مقصود تک پہنچنے کی مشکلات اور صعوبتیں صرف "امید" کے سہارے جھیلی جاتی ہیں۔ اس تاول میں ایک جگہ مسیحی اپنے سفر کے دوران گہرائی میں پہنچتا ہے اور یہاں تین اشخاص "بیوقوف، سست اور نخوت" کو پاؤں میں بیڑیاں پہنے سوتے پایا۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر مسیحی ان کے نزدیک گیا کہ انھیں خوابِ غفلت سے بیدار کرے اور کہا کہ تم ایسے لوگوں کی مانند ہو جو جہاز کے مستول کے سرے پر سوار ہیں۔ (امثال ۲۳، ۳۴) تمہارے نیچے اتھاہ سمندر ہے۔ جاگو اور اٹھو کہ میں تمہارے پاؤں کی بیڑیاں کاٹنے میں مدد کروں گا۔ اگر تمہارا مخالف ابلیس جو گرجنے والے شیر ببر کی طرح ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ اس طرف کو آنکلا تو بس تم اس کا شکار ہو چکے۔ (۱۔ پطرس ۵: ۸) اس کا انھوں نے یوں جواب دیا:

بیوقوف = میں تو کوئی خطرہ نہیں دیکھتا

سُست = ابھی ذرا اور سونے دو

نخوت = ہر شخص کو اپنے ہی پاؤں پہ کھڑا ہونا چاہیے۔

(صفحہ ۱۷ مسیحی کا سفر، بارھواں ایڈیشن ۱۹۶۱ء)

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ "مسیحی کا سفر" ایسے کرداروں پر مشتمل ہے جو اپنے ناموں کے لغوی معانی کی ترجمانی کرتے ہوئے ملتے ہیں جیسے بیوقوف، سُست، نخوت اور خود مسیحی، علاوہ اس کتاب میں لالہ کینہ پرشاد، منشی نیکی ندارد، مرزا عشق بہائی، میاں آزاد گمراہ، پنڈت جلد باز، قاضی دشمنِ ایمان، منشی دروغ گو، شیخ دشمن روشنی، سردار سنگدل سنگھ، مطلبی، ناسنک

نادان۔ رحمت، دانش اور دلاور کے کرداروں کے بارے میں یہ جاننے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ان کا کردار کیا ہوگا۔ یہ طے شدہ امر ہے کہ یہ تمام افراد اپنے ناموں کے معانی پر پورے اُتریں گے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے "مراۃ العروس" اور "بنات النعش" میں بھی اپنے کرداروں کے بامعنی ناموں کو "صفات" سے متصف کیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے "مراۃ العروس" میں کرداروں کے نام مکالمے کے آغاز میں لکھنے کا رواج شروع کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ناول سے زیادہ ڈرامہ کی ٹیکنک ہے۔ یہ انداز کسی بھی عنوان سے فنّی بالیدگی کا مظہر نہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نپے تُلے قدم اٹھا رہے ہیں۔ وہ خلطِ مبحث کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک صنف بتدریج اپنے کمالات کے مقامات اور ستمیں طے کرتی ہے۔ اور اردو ناول بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد خود بھی ترجمہ کے فن کے ماہر تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۶ء میں "سمٰوات" کے نام سے علم ہیئت کی انگریزی کتاب کا ترجمہ کیا۔ اس سے پہلے وہ قانون، انکم ٹیکس اور تعزیراتِ ہند کا ترجمہ کر چکے تھے اور کانپور کی تحصیلداری اور پھر بعد میں ڈپٹی کلکٹری اچھے ترجمہ کے انعام کے طور پر ہی ملی تھی ڈپٹی نذیر احمد کے یہاں انگریز افسران سے داد و ہش چاہنے کا رجحان بہت زیادہ تھا۔ انھوں نے سر ولیم میور کے ذریعہ ایڈنبرا یونیورسٹی سے ۱۹۰۲ء میں ایل۔ ایل۔ ڈی اور پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۱۰ء میں ڈی۔ او۔ ایل کی ڈگریاں حاصل کیں وہ اس طرح اردو ادب کے "عناصر اربعہ" میں دنیاوی درجات میں اضافہ کے لیے کوشاں رہنے والے وہ واحد بزرگ تھے جنھیں ایڈنبرا سے ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری ملی۔

ڈپٹی نذیر احمد برصغیر میں عیسائیت کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں ہونے والی کوششوں سے بخوبی واقف تھے ان کی تصنیفات میں بعض ایسے جملے بھی نظر آجاتے ہیں جس کی زد مقدس سے مقدس ہستی پر بھی پڑتی ہے۔ یہ کہہ لیں کہ اسٹائل کی یہ بے اعتدالیاں انگریز اقسران کو خاص مرغوب تھیں۔

"امہات الامہ" کی اشاعت پر تو ایک ہنگامہ ہی کھڑا ہو گیا تھا اور نوبت کتاب سوزی تک جا پہنچی۔

یہ ناممکن ہے کہ انجیل کے بعد انگریزی زبان کی دوسری بڑی کتاب THE PILGRIM'S PROGRESS اردو میں "مسیحی مسافر کا احوال" میں منتقل ہو اور ڈپٹی نذیر احمد کی نظر سے نہ گزرے صرف ایک سال کے بعد ہی۔ یعنی ۱۸۶۹ء میں "مراۃ العروس" شائع ہو گئی ہے۔ اس کے بعد "بنات النعش" (۱۸۷۳ء) "توبۃ النصوح" (۱۸۷۷ء) "فسانۂ مبتلا" (۱۸۸۵ء) اور "ابن الوقت" (۱۸۸۸ء)

"مراۃ العروس" کی خاص بات یہ ہے کہ یہ مکالماتی، ڈرامائی انداز کا ناول ہے۔ یعنی ناول کی شکل میں آگے بڑھتا ہے اور ان مکالمات کے کردار "اسم با مسمّٰی" ہیں۔ بیوقوف، سُست، منشی نیکی ندارد، لالہ کینہ پرشاد، اور سردار سنگدل سنگھ جیسے کرداروں کے BEHAVIOUR میں سرّیت کے لیے بہت ہی کم گنجائش نکل سکتی ہے۔ کیا یہ مقامِ تعجب نہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد صرف ایک سال بعد ہی بعینہٖ اسی تیکنک میں تمثیلی داستانوں کی بجائے ناول نویسی کا آغاز کرتے ہیں اور وہ حد درجہ کامیاب ہوتے ہیں۔ "مراۃ العروس" کے متعدد ایڈیشن نکلے اور یہ ناول ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوا۔

اس حقیقت میں کیا کلام ہو سکتا ہے کہ اردو ناول بذاتِ خود مغربی ناول سے مستعار صنف ہے۔ ناول

کی حد تک تو یہ بات صحیح ہے ہی لیکن دل چسپ بات یہ ہے کہ "مراۃ العروس"، کا مکالماتی انداز اور اسم بامسمیٰ کردار جون بنین کے ناول کے اردو ترجمہ "مسیحی کا سفر" سے خاص حد تک ملتا ہے۔

کیا یہ دل چسپ نہیں کہ "مسیحی مسافر کا احوال" اسلوبِ نگارش اور کرداروں کو متعارف کرانے کے طریقۂ کار کی حد تک "مراۃ العروس"، کا قریب ترین پیش رو ہے اور اس طرح اس ناول کو، ترجمہ سے قطع نظر اردو زبان کا پہلا ناول بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

حقی کا ایک نادر شعری کارنامہ

قہرِ عشق

شیکسپیئر کے شہرہ آفاق ڈرامے انطنی کلوبطرہ کا منظوم و مقفیٰ ترجمہ
صفحہ بہ صفحہ اصل انگریزی متن کے ساتھ

یہ شیکسپیئر کے سب سے طویل رومانی ڈرامے کا اردو روپ ہے جس میں سیاست سے لے کر محبّت تک، اور بری و بحری جنگوں سے لے کر عشرت گاہوں کی رنگینیوں تک دل چسپ اور مسحورکن واقعات و سانحات کی ایک دنیا سمائی ہوئی ہے۔ کلوبطرہ کا منفرد کردار اور اس کے مختلف روپ کہ وہ عورت بھی ہے ملکہ بھی، سیاست میں الجھی ہوئی اور دامِ محبت میں بھی گرفتار۔ اُس کی طنّازی، طرّاری، چہلیں، رنگ رلیاں، خواصوں اور شاگرد پیشہ کی آپس کی چھیڑ چھاڑ، اور پھر اس تمام افسانے کا حسرتناک انجام جو ملکہ کی خودکشی پر ہوا۔ کلوبطرہ کے آخری لمحات کی دل گداز تصویر، غرض ایک بے مثل ادبی کارنامہ ہے، زبان و بیان کی خوبیوں سے مالا مال۔ کہیں زورِ خطابت ہے تو کہیں روزمرّہ کا لطف اور کسی ایک سطر پر بھی ترجمے کا گمان نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر میاں بشیر احمد مرحوم نے بھرے جلسے میں کہا تھا کہ معلوم ہوتا ہے اصل یہ ہے اور ترجمہ شیکسپیئر نے کیا تھا۔ حقی صاحب کے بقول یہ اردو اسالیب کی ایک آزمائش تھی۔ اُردو اس میں کس طرح پوری اتری ہر پڑھنے والا اس کی گواہی دیگا۔

انجمن ترقی اردو نے مترجم کے اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے رنگین باتصویر سرورق کے ساتھ اہتمام سے عمدہ کاغذ پر شائع کیا۔ قیمت ۔/۷ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ، کراچی

ڈاکٹر انور سدید

کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ

جمیل الدّین عالی ـــــ فن اور شخصیت ۔ مرتّبہ : ایم حبیب خان

کتنی عجیب بات ہے کہ جمیل الدّین عالی پاکستان کی سوہنی دھرتی کے سجیلے اور جیالے ادیب ہیں لیکن ان کا جامع نقش مرتّب
کرنے کے لیے ایک خوبصورت کتاب بھارت سے شائع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے "جمیل الدّین عالی ــ فن اور شخصیت"۔ اور مرتّب
ہیں ایم حبیب خان جو اس سے قبل عالی کے دوہوں کا انتخاب بھی شائع کر چکے ہیں۔ بھارت سے یہ زندہ دوستی کی پہلی مثال نہیں ۔
اس سے قبل مشفق خواجہ صاحب پر ایک وقیع کتاب ڈاکٹر خلیق انجم پیش کر چکے ہیں۔ خواجہ صاحب ان دنوں بھارت کے دورے
پر تھے ۔ دہلی سے بمبئی گئے، واپس آئے تو مکتبہ جامعہ دہلی کے شاہد علی خان نے نہ صرف کتاب مرتّب کر لی تھی بلکہ اسے زیورِ کتابت و طباعت
کے مراحل سے بھی گزار دیا تھا۔ جس نے سُنا وہ ڈاکٹر خلیق انجم کی تیز کاری اور شاہد علی خان کی تیز اشاعتی پر حیران رہ گیا۔ آپ اس کا
بے شک جو مطلب چاہیں نکال لیں، میں تو یہ عرض کروں گا کہ مشفق خواجہ ہوں یا جمیل الدّین عالی ـــ ادیب کسی ایک ملک، قوم
یا خطّے کی ملکیت نہیں ہوتا اور ادب دیوارِ وطن عبور کر جائے تو بین الاقوامی ہو جاتا ہے۔ ہندوستان نے یہ روایت اچھی ڈالی
ہے اور اس روایت کی تقلید کے کچھ آثار ہمارے ہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ تاج سعید نے راجندر سنگھ بیدی پر
ایک شاندار خاص نمبر "جریدہ" کا نکالا تھا۔ کرشن چندر کے فکر و فن پر ایک جامع کتاب مرتّب کی۔ خواجہ محمد زکریا نے حال ہی میں
بلونت سنگھ پر ایم اے کی ایک طالبہ سے مبسوط مقالہ لکھوایا ہے۔

جمیل الدّین عالی پر یہ کتاب کسی اضطراری خیال کا نتیجہ نہیں۔ حبیب خان اس منصوبے پر ۱۹۸۵ء سے کام کر رہے تھے،
مشفق خواجہ کے مرتّب کردہ "تخلیقِ ادب" میں جمیل الدّین عالی پر گوشہ بھی ان کی نظر سے گزر چکا تھا۔ لیکن وہ اس بیان میں کچھ
اور وسعت بھی چاہتے تھے اور ہرچند کہ انھیں عالی صاحب سے دیرینہ رفاقت کا شرف حاصل نہیں لیکن وہ ان کے کردار کے اس پہلو سے مسحور رہے کہ

"عالی صاحب چھوٹوں سے محبّت کرتے ہیں اور انھیں آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔"

عالی صاحب کا یہ پہلو انھیں اس لیے اچھا لگا کہ حبیب خان نے زندگی میں اردو کی بعض ایسی شخصیتوں کو دیکھا تھا جو اپنے ہم عصروں کو
آگے بڑھانے کے بجائے ان کو غلام بنا کر رکھتی ہیں اور اس بات سے ہر وقت خوف زدہ رہتی ہیں کہ اگر نئی نسل کے جوہر باہر آ گئے تو اس
قسم کے بزرگوں کی شخصیت ڈھک جائے گی اور خود ان کے آگے بڑھنے کے مواقع مسدود ہو جائیں گے۔ ایم حبیب خان کی اس بات کو

ہم نے پہلے تو اس کتاب کے پیش لفظ کی ایک ایسی ضرورت سمجھا جس سے قاری کو آسانی سے چونکایا جا سکتا ہے۔ لیکن اسی شام جب سُمت پرکاش شوق صاحب نے ہمیں مولانا تاجور نجیب آبادی کا ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۳ء کا ایک مراسلہ دیکھایا تو ہمارے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مولانا تاجور نے اسے ہدایت نامے کا عنوان دیا تھا اور یہ ان کے شاگردوں کے لیے تھا۔ لکھتے ہیں:

"میں اصلاح کو ایک دماغ کش تکلیف سمجھتا ہوں، میری اصلاح ذمہ دارانہ پہلو رکھتی ہے اور اس لیے میرے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے۔ میں اپنے شاگردوں کے لیے ادبی شہرت کے تمام مواقع حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور یہ میری اصلاح شاگرد کی شہرت کے لیے میری جد وجہد بالکل بلا معاوضہ، بغیر شائبۂ طمع ہوتی ہے۔ بنا بریں میں شاگرد کو اپنا اک ایسا روحانی فرزند تصوّر کرتا ہوں جو ایک غلام کی طرح میرا فرماں بردار ہو۔ میرے ساتھ میرے معاصرین، میرے شاگردوں کی بھی عزّت کرے، ادبی مشوروں پر بالکل میرے نقشِ قدم پر چلے۔ عملاً ایسا موقع کبھی نہیں آیا۔ لیکن میرے شاگردوں کو میرے بوٹ پالش کرنے سے بھی عار نہ ہونا چاہیئے....

مختصر یہ کہ میرا شاگرد اپنے شوقِ شہرت کو بالکل میرے حوالے کر دے۔"

ایم حبیب خان کو جن بڑے ادیبوں سے واسطہ پڑا ہے وہ یقیناً متذکرہ بالا مسلک کے لوگ ہوں گے اور ادیب کو غلام بنانے کی روش کو عزیز جانتے ہوں گے۔ عالی صاحب بیسویں صدی کے ربع آخر کے روشن خیال اور روشن ضمیر ادیب ہیں۔ وہ ادب کی شمع کو روشن کرنے کے لیے فکر و نظر کی توسیع چاہتے ہیں اور جہاں جوہرِ قابل نظر آتا ہے اس کو زندہ رکھنے اور ارتقا کا اگلا قدم اٹھانے میں مدد دیتے ہیں۔ ہمیں علم ہے کہ انھوں نے پاکستان میں متعدد ادیبوں کو ادب اور زندگی میں پاؤں جمانے میں مدد دی لیکن جب ان کے قدم جم چکے تو عالی صاحب پر انھیں کی طرف سے پتھر بھی برسے اور انھوں نے کمیں گاہ کی طرف دیکھا تو عالی کی ملاقات اپنے ہی دوستوں سے ہو گئی۔ چناں چہ کتاب تو کیا کسی کو کبھی مضمون لکھنے کی توفیق بھی نہیں ہوئی۔ اس پس منظر میں ایم حبیب خان کی جتنی تعریف بھی کی جائے کم ہے کہ انھوں نے رسمی تعلقات کی عدم موجودگی میں اور مفادات کی چاندنی میں شرابور ہوئے بغیر عالی صاحب پر جناب مالک رام، مختار الدّین احمد، جگن ناتھ آزاد، پروفیسر مسعود حسین، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی، ڈاکٹر ضیا الدّین انصاری اور پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے نئے مضامین لکھوائے۔ انھوں نے پاکستانی ادیبوں کو بھی مہمیز لگائی، انھیں بھی مائل بہ اظہار کیا اور تین سو چھہتّر صفحات کا یہ خوبصورت مرقع پیش کر دیا جس میں عالی کی شخصیت اور شاعری، سفرنامے اور انٹرویوز سب سما گئے ہیں۔ اجمال میں بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے انھیں دو ہے میں رجحان ساز تسلیم کیا ہے۔ مسعود حسین خان کے نزدیک "عالی نے اردو اور ہندی کا بیک وقت سہارا لیا اور بعض اوقات دونوں کو ہمہ گیر بھی کر دیا۔" مختار الدّین احمد کا ان سے پہلی ملاقات میں تاثر یہ تھا:

"بڑے خوش گفتار اور خوش اخلاق، بے تکلّف اور بڑے بے ساختہ، انگریزی بھی بہت اچھی بولتے ہیں اور شعر بھی خوب کہتے ہیں۔"

مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ "عالی پاکستانی ادب کی تاریخ کا حصّہ ہیں۔ پاکستانی ادب کے رجحانات اور میلانات پر ان کی دسترس محرمانہ

ہے کیوں کہ رجحانات و میلانات کو بروئے کار لانے میں وہ خود بھی شریک رہے ہیں۔"

عالیؔ صاحب کی یہ تخلیق بیرونِ پاکستان سے اُبھری ہے اس لیے معتبر اور وقیع ہے۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کی ہے۔ میں اسے اہلِ ہند کا قیمتی تحفہ تصوّر کرتا ہوں جو بابائے اردو مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو پاکستان، جمیل الدین عالیؔ اور سب رفقائے اردو کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو اب پاکستان میں بھی چھپنا چاہیے۔

متاعِ نور ـــــــ درشن سنگھ

دلّی رنگ و نور کا شہر ہے، اس رنگ و نور سے گزر کر جب آپ دہلی یونیورسٹی کے وسیع و عریض احاطے میں داخل ہوں تو دوسری طرف سے خوشبو کا ایک جھونکا آپ کی طرف آتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اور جوں جوں آپ قدم آگے بڑھاتے ہیں یہ خوشبو دبیز ہوتی جاتی ہے۔ جب میں اس تجربے سے گزرا تو ڈاکٹر وزیر آغا، جوگندر پال اور کرشنا پال کے ہم رکاب تھا۔ ہمارے رہنما ڈاکٹر عنوان چشتی تھے۔ جو اس خوشبو کو لفظوں میں سمیٹتے چلے جارہے تھے۔ اچانک وہ ہمیں لے کر ایک ایسے مقام پر رک گئے جہاں سنت درشن سنگھ نے اپنی سمادھی جما رکھی تھی۔ انھیں دیکھا تو بظاہر سادہ اور بے رنگ سے انسان نظر آئے لیکن جب باتیں کرنے لگے تو محسوس ہوا کہ ان کی باتوں سے اُبھرتی والی خوشبو روحوں کا رنگ اُتار رہی تھی، سنت درشن سنگھ کائنات کے سربستہ رازوں کو جاننے والے درویش مزاج انسان ہیں لیکن رنگ، نسل، قوم اور مذہب کے تعصّبات سے بلند ہیں۔ وہ صادق قدروں میں ایمان کو مستحکم کرکے آدمی کو انسان بنانے کی سعی کرتے ہیں۔ شاعری میں ان کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ان کا مرکزی موضوع انسان اور محبّت ہے ان کی شاعری ریاضت نہیں بلکہ جستجو کے حق میں دل سے ابھرنے والا نغمۂ سرمدی ہے۔ وہ روحانی سرور اور وجدانی کیفیت سے مسحور ہو کر شعر کہتے ہیں اور جدید دنیا کے فلسفے کو انسانی سماج سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان کا پیغام ـ پیغامِ محبّت ہے جو لبِ شاعر سے نکل کر لفظوں کا روپ اختیار کرتا ہے تو لاکھوں کروڑوں دلوں میں اتر جاتا ہے۔ اردو زبان پر بابا درشن سنگھ جی کی حیرت انگیز قدرت ان کی شاعری کا ایک اور وصفِ خاص ہے۔ چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

خاک سے تا بہ کہکشاں ہم نے تو جب کیا سفر　　عشق ملا قدم قدم حُسن ملا نظر نظر
حُسن سے بھی سوا ہے کچھ عشق کی روشنی ہمیں　　وہ ہے چراغِ انجمن یہ ہے چراغِ رہ گزر

ـــــــــــــ

کٹ گئی عمر محبّت کے سفر میں لیکن　　صبح کو شامِ تمنّا سے گریزاں دیکھا

ـــــــــــــ

نفس نفس مجھے لازم ہے شکر کا سجدہ　　کہ میرے دوست کا احساں ہے زندگی میری

صوری لحاظ سے بھی یہ کتاب بہت خوبصورت چھپی ہے۔ اور ساون کرپال پبلی کیشنز وجے نگر دہلی سے بلا قیمت مل سکتی ہے۔

فکرؔ تونسوی ـــــــ حیات اور کارنامے، مرتبہ: ڈاکٹر شمع افروز زیدی

فکر تونسوی کی زندگی کی واردات بھی عجیب تھی، وہ تونسہ جیسے دور افتادہ مقام پر پیدا ہوا تو دیکھا کہ ان کا عطّار باپ

ایک سید حکیم کے ساتھ مل کر غریب مریضوں کا استحصال کرتا تھا۔ بیٹے کو تونگر باپ سے نفرت ہوگئی۔ فکر تونسوی اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر اپنی قسمت آپ بنانے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ ڈیرہ غازی خان، جام پور، ملتان، لائلپور، شیخوپورہ ہوتا ہوا لاہور پہنچا اور رسالہ "ادبِ لطیف" میں کلرک کے عہدہ جلیلہ پہ فائز ہو کر شاعری کرنے لگا۔ ۱۹۴۷ء میں اس کی شاعری کا پہلا مجموعہ "ہیولے" چھپا۔ اس کتاب کا پیش لفظ کنہیا لعل کپور نے لکھا تھا۔ انھوں نے فکر کو ایک ایسا شاعر قرار دیا جو نئی اور اچھوتی بات کہنا چاہتا ہے۔ لیکن پھر ملک کو آزادی مل گئی اور فکر تونسوی امرتسر اور جالندھر کے راستے دہلی پہنچ گیا۔ جہاں اس نے شاعری ترک کر دی اور پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے طنز و مزاح لکھنا شروع کر دیا۔ اور اب طنز و مزاح ہی سے ان کا تشخص قائم ہوتا ہے۔ شاعری قصۂ پارینہ ہے جس کا سراغ فکر تونسوی کی وفات کے بعد ان کے غم گساروں نے لگایا ہے اور اب ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے فکر کی شاعری کو اپنی کتاب "فکر تونسوی ــ حیات اور کارنامے" میں پیش کر دیا ہے۔ انھوں نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ :

"فکر کے بغیر طنز و مزاح کی تاریخ ادھوری رہے گی۔ ان کا طنز و مزاح مقصدی ہوتا ہے۔ وہ معاشرے کی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں پر بھرپور طنز کرتے ہیں۔"

کم و بیش چالیس برس تک معاشرے کو اپنی ناہمواریوں کا احساس دلانے کے بعد گزشتہ سال فکر تونسوی لکھتے لکھتے اچانک رک گئے۔ ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے ان کی وفات کے بعد ان کی شخصیت اور کارناموں پر جو کتاب پیش کی ہے وہ معنوی طور پر ایسا خراجِ تحسین ہے جو فکر تونسوی کا حق تھا۔ وہ بیسویں صدی کے ممتاز طنز و مزاح نگار تھے۔ شمع افروز زیدی نے ان کی اس حیثیت کو پہچانا اور ان پر زیرِ نظر فکر افروز کتاب مرتب کرنے میں تاخیر نہیں کی۔ ایسے اچھے کام کرنے کی توفیق عام طور پر لوگوں کو نہیں ہوتی۔

یہ کتاب گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ فکر تونسوی کی شخصیت کے باب میں میرزا ادیب، ظفر پیامی، ترلوچن کمار رشاد، بلونت گارگی کشمیری لعل ذاکر، یوگندر پالی کے مضامین شامل ہیں۔ اور ان سب سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ فکر تونسوی نے اپنی انا کے خناس کو پالنے کے بجائے ہمیشہ اس سانپ کا سر کچلنے کی کوشش کی۔ وہ فوت ہوئے تو ستر واں سال عبور کر رہے تھے۔ لیکن حواس سلامت تھے۔ قلم مصروفِ طنز تھا اور طبیعت شگفتہ تھی، نہ زمانے سے شکایت کرتے نہ مطلب پرست، احباب کو مائل بہ تعریف کرتے۔ ان کی شخصیت کے ان گوشوں کا اثبات ڈاکٹر مظفر حنفی کے انٹرویو سے بھی ہوتا ہے۔ فکر ان خوش نصیب ادیبوں میں سے تھے جن کے فن کی داد کرشن چندر، کنہیا لعل کپور، ممتاز مفتی، شفیق الرحمٰن، ڈاکٹر وزیر آغا، بلراج کومل، دیویندر اسر اور دلیپ سنگھ جیسے نامور ادیبوں نے دی۔ اس کتاب میں ۲۱ مضامین میں ان کی طنز و مزاح نگاری کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ فسادات ۱۹۴۷ء پر فکر کا روزنامچہ "چھٹا دریا" کے نام سے چھپا تھا اور نایاب تھا۔ شمع افروز زیدی نے یہ روزنامچہ ڈھونڈ کر اس کتاب میں پیش کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی فکر کا نایاب کلام اور غیر مطبوعہ نگارشات کو بھی کتاب میں نمایاں جگہ دی گئی ہے۔ اس کتاب کا ایک اہم حصہ فکر تونسوی کے نادر و نایاب خطوط اور تصویریں ہیں۔ یوں سمجھیے کہ فکر تونسوی جیتا جاگتا ہمارے سامنے آجاتا ہے اور اپنی شخصیت کا ایک مستحکم نقش پڑھنے والوں کے دلوں پر مرتب کر دیتا ہے۔ شمع افروز زیدی نے یہ کتاب خلوص کی بے پایانی سے مرتب کی ہے اور ڈاکٹر شمع کی نسائی لطافت ہر صفحے پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ فکر تونسوی کی موت "بیسویں صدی" کا المیہ ہی نہیں تھا، شمع افروز زیدی کا ذاتی المیہ بھی تھا۔ چناں چہ وہ گھر کے ایک بزرگ کی رحلت پر نالہ کناں نظر آتی ہیں اور قاری ان کے غم میں شریک ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

گول مال ـــــــ شفیقہ فرحت

گزشتہ چند سالوں کے دوران ہندوستان سے جو چند اچھے مزاح نگار ابھرے ہیں ان میں شفیقہ فرحت کا نام بے حد معروف اور ممتاز ہے۔ ان کے تیرہ مزاح پاروں کا مجموعہ کسی مقدمے یا پیش لفظ کے بغیر "گول مال" کے عنوان سے مکتبہ نئی آواز، جامعہ نگر دہلی نے شائع کیا ہے۔ شفیقہ فرحت کی منفرد خوبی یہ ہے کہ وہ لفظ یا کردار کا چہرہ بگاڑ کر مسکراہٹ کو جنم نہیں دیتیں۔ ان کی نظر معاشرے کی بوالعجبیوں اور ناہمواریوں پر رہتی ہے اور وہ مضحک حقیقت کو منظرِ عام پر اس طرح لاتی ہیں کہ قاری بہت محسوس کرنے لگتا ہے۔ "سیانے چوہے"۔ "بد اور بدنام"۔ "ڈھنڈورا"۔ "تقریب ہماری"، اور متعدد دوسرے مضامین میں انھوں نے مزاح کو شعوری عمل بنانے کے بجائے اسے بے ساختہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے مضامین میں واقعہ غنچے کی طرح کھل اٹھتا ہے۔ ان کے ہاں زندگی کو معصوم نظر سے دیکھنے کا رجحان نمایاں ہے۔ چناں چہ وہ بڑی سے بڑی بات ہو، اس کو بھی اس معصومیت سے آشکار کرتی ہیں کہ نہ معاشرے کا امن تباہ ہوتا ہے اور نہ کردار کی صورت مضحک ہوتی ہے۔ میں انھیں کسی مغربی مصنف سے تشبیہ دینے کی کوشش کروں تو جیروم کے جیروم کا نام ذہن میں آتا ہے۔ "گول مال" مزاح کی ایک عمدہ کتاب ہے جس کا خیر مقدم کرتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے۔

حرفِ چند

از

جمیل الدّین عالی

قیمت: سَو روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ، کراچی ۱

ڈاکٹر منیر الدین احمد

عربی ضرب الامثال

APHORISM (مقولہ) کی صنف کو یورپی زبانوں کے ادب میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ جب کہ اس صنف کا آغاز مشرق میں ہوا تھا۔ چناں چہ سنسکرت، عبرانی اور عربی زبانوں میں اس کی روایت بہت پرانی ہے۔ بالخصوص توریت میں اس کے بیش بہا نمونے ملتے ہیں۔ اکثر صورتوں میں مقولہ جات اور حکمت کی باتوں نے محاورات اور ضرب الامثال کا روپ دھار لیا ہے۔ عربی زبان میں حکمت مؤجزۃ کا خزانہ بہت بڑا۔ اور ایسی باتوں سے بھرا ہوا ہے جن کی طرزِ ادا ماڈرن اور جن کا مضمون تازگی اور دوام کا حامل ہے۔

— زندہ رہنا مشکل کام ہے اور مرنا مشکل تر

— غربت انسان کے ماتھے پر کلنک نہیں لگاتی، مگر وہ چبھتی ضرور ہے

— وہ اسے پھانسی دینے کے لیے لے کر گئے اور اس نے رنگ دار رسی کا مطالبہ کیا

— کتا، کتا ہی رہتا ہے خواہ انسان اس کے گلے میں سونے کا پٹہ ہی کیوں نہ ڈال دے

— سایہ سیدھا نہیں ہوسکتا اگر لاٹھی ٹیڑھی ہو

— اندھیرا بہتر ہے اندھے پن سے۔

— ایک سرپھرا کنوئیں میں ایک پتھر پھینکتا ہے اور دس دانش مند اس کو نہیں نکال سکتے

— اجنبی اندھا ہوتا ہے آنکھیں رکھنے کے باوجود

— ملاوٹ شدہ کھٹا ہوا دودھ، جسے انسان چکھ سکتا ہے، بہتر ہے ملاوٹ سے عاری دودھ سے جسے چکھنے کی اجازت نہیں

— ہر گرنے والے پھل کو کوئی ہاتھ مل جاتا ہے جو اسے اٹھا لیتا ہے

— گدلے پانی کو تلف نہ کرو جب تک مصفا پانی نہ مل جائے

— چوزوں کو نہ گنو جب تک وہ انڈے سے باہر نہ نکل آئیں

— ہر بدلی پانی نہیں برساتی

— اگر تمہاری قمیص ریشم سے بنی ہوئی تھی تو اس کے چیتھڑے کم از کم باقی ہونے چاہئیں۔

——— کتوں کے بھونکنے سے بادل ذرہ بھر مرعوب نہیں ہوتے۔

——— اندھیرا اس وقت تک نظر آتا جب تک روشنی نہ گُل ہو جائے۔

——— پانی کو چکّی میں پیسو تو پانی ہی نکلے گا۔

——— گدھا اگر ریشمی لباس بھی پہن لے تو لوگ یہی کہیں گے کہ تم کیسے شاندار گدھے ہو۔

——— بدّو چالیس برس کے بعد بدلہ لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نے بدلہ لینے میں جلدی سے کام لیا ہے۔

——— پُل سے نہ کود پیش تر اس کے کہ تم پُل پر پہنچ جاؤ۔

——— کھانے کو کھاؤ جو تمہارا جی چاہے مگر کپڑے دوسروں جیسے پہنو۔

——— ہر داڑھی کے لیے کوئی نہ کوئی کنگھی پائی جاتی ہے۔

——— جب بلّی کو بتایا گیا کہ اس کے فضلے کو دوائی کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے تو اس نے اپنا فضلہ چھپانا شروع کر دیا۔

——— جس کا باپ کتّا ہے اسے بھونکنا چاہیے۔

——— جو کوئی عمر میں ایک دن بڑا ہے وہ عقل میں ایک سال بڑا بنتا ہے۔

——— اجنبی وہ ہے جس کا کوئی دوست نہیں۔

——— ہزار دشمن مکان سے باہر بہتر ہیں ایک دشمن سے جو اس کے اندر پایا جاتا ہے۔

——— اگر تمہارا دوست شہد کا بنا ہوا ہے تو اس کو چاٹ چاٹ کر ختم نہ کر دو۔

——— اپنی زبان کو قابو میں لاؤ ورنہ وہ تم کو اپنے قابو میں لے آئے گی۔

——— زبان میں ہڈی نہیں پائی جاتی مگر وہ ہڈیوں کو توڑ سکتی ہے۔

——— مصر اس شخص کے لیے دُور نہیں جو وہاں جانا چاہتا ہے۔

——— ہوا بھلا بنجر چٹانوں سے کیا چھین سکتی ہے؟

——— اگر انسان چاہتا ہے کہ دوسرے سنیں تو اُسے ڈھول قالین کے نیچے نہ بجانا چاہیے۔

——— اگر مرنے والے نہ مرتے تو زندوں کو گھر کیسے ملتے۔

——— ہم مطمئن ہیں اپنی شومئی قسمت سے، مگر ہماری شومئی قسمت ہم سے مطمئن نہیں۔

——— اگر چیونٹی تمہاری دشمن ہے تو اسے ایک ہاتھی جانو۔

——— جب انسان دانش کی تلاش میں رہتا ہے وہ دانش مند ہے۔ مگر جب وہ سمجھتا ہے کہ اس کو دانش مندی مل گئی ہے تو وہ جاہل بن جاتا ہے

——— حکومت کا درجۂ استحکام اس درجہ انصاف سے وابستہ ہے جو ملک میں رائج ہے۔

——— مانگے کا کمبل گرم نہیں ہوتا۔

——— مینڈک ٹرّاتا ہے مگر دریا خاموش رہتا ہے۔

——— جیسے موتیوں کی چاہت ہے اسے سمندر میں غوطہ لگانا پڑتا ہے۔

______ جو کوئی منور چاہتا ہے اسے ہندوستان کے سفر کی زحمت اٹھانی پڑتی ہے۔

______ ہر دن کے ہمدم اپنے ہوتے ہیں۔

______ کتّے کی دُم اس کے جیتے جی سیدھی نہیں ہو سکتی۔

______ کوئی شخص پیدائشی طور پر دانش مند نہیں ہوتا۔

______ وقت لاٹھی کو اُگاتا ہے مگر اس پر لوہے کا پھل لگا کر برچھی اسے انسان بناتا ہے۔

______ شیر کو ڈراؤ پیشتر اس کے کہ اس کا ڈر تم پر قابض ہو جائے۔

______ کسی نادار کو کھجور دو اگر تم اس کے صحیح ذائقے کو جاننا چاہتے ہو۔

______ نادار اپنے وطن میں بھی اجنبی ہوتا ہے۔

______ قاضی کا گدھا مرے تو سوگواروں کا ہجوم اکٹھا ہو جاتا ہے۔ جب قاضی مرتا ہے تو لاش لاوارث پڑی رہتی ہے۔

______ جھوٹے کے دفن کیے جانے پر بھی اعتبار نہ کرو۔

______ دھاگے کا کہنا ہے کہ وہ بے قصور ہے۔ سوئی اسے کھینچتی ہے۔

______ انسان بے پیدائش کے بچے کو نہیں نہلاتا۔

______ ہر کوئی مالٹے کو اپنی طرز پر چھیلتا ہے۔

______ ستارے کتوں کے بھونکنے سے جگمگانا نہیں چھوڑ دیتے۔

______ دوسروں کا اونٹ چارہ کم کھاتا ہے اور تیز چلتا ہے۔

______ پتھر کو لکڑیوں کے ایک پورے ٹال سے نہیں پکایا جا سکتا

______ جو کوئی سنگِ مرمر میں گالیاں تراشتا ہے اور نیکی کے کاموں کو ریت میں لکھتا ہے وہ اپنی زندگی کو خود مشکل میں ڈالتا ہے۔

______ جو کوئی سائے میں پناہ ڈھونڈتا ہے اس کا پسینہ نہیں بہے گا۔

______ اگر تم چالیس روز تک لوگوں کے ساتھ رہو تو یا تو ان جیسے بن جاؤ گے یا ان سے علیحدگی اختیار کر لو گے۔

پنجابی زبان و ادب

مصنف: حمید اللہ ہاشمی

قیمت: ۵۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ — کراچی ۱

ساجد منصور قیصرانی

اردو، انگریزی سرزمین میں

یہ غلط فہمی عام ہے کہ برصغیر کے تارکینِ وطن برطانیہ میں دوسری جنگِ عظیم کے بعد پہنچے۔ حالاں کہ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے لوگ برطانیہ میں ۱۸۷۰ء کے آس پاس آباد ہونے لگے تھے۔ ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان دوطرفہ تجارتی تعلقات انیسویں صدی کے درمیانی عرصے میں قائم ہو چکے تھے اور برطانیہ کی جہاز راں کمپنیوں نے خاصی تعداد میں اپنے جہازی عملے میں ہندوستانیوں کو ملازمت دینی شروع کر دی تھی۔ ان جہازیوں میں کچھ تو وہ تھے جو اپنے ظالم افسروں کے ظلم سے بچنے کے لیے یہاں آ گئے تھے۔ کچھ کو معاشی خوش حالی کے امکانات کھینچ لائے تھے۔ رفتہ رفتہ ترکِ وطن کا یہ سلسلہ بڑھتا گیا، اور برصغیر سے لوگ آ کر لندن، ہیسٹنگز، پلائی موتھ اور ایبرڈین میں آباد ہو گئے تھے۔

۱۸۷۳ء کی مطبوعہ ایک کتاب "دی ایشیاٹک ان لنڈن" میں جوزف سالٹر نے لندن کے ایسٹ اینڈ میں کافی تعداد میں آباد ہندوستانیوں کی نشاندہی کی ہے۔ کچھ جہازیوں نے بندرگاہوں کو چھوڑ کر ساحلی آبادی کو اپنی قیام گاہ کے لیے انتخاب کیا اور پھر آپس میں ہمیشہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہنے کی صورت نکالی اور اپنی اقتصادی و معاشی بہبود کے لیے ایک خاص علاقے کو ترقی دی جو ان کی ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بنے اور ان کے کاروبارِ حیات میں بھی استحکام پیدا کر سکے۔

۱۸۷۰ء کے لگ بھگ برصغیر کے دانش ور، کاروباری اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد برطانیہ میں موجود تھی۔ سر سید احمد خاں ۱۸۷۴ء میں آکسفورڈ گئے اور نوبل انعام یافتہ شاعر رابندر ناتھ ٹیگور ۱۸۷۸ء میں یونیورسٹی کالج لندن میں انگریزی ادب اور موسیقی کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اس پس منظر میں لندن سے اردو کا پہلا ہفتہ وار "آئینۂ انگریزی سوداگری" ۱۸۸۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔

جرائد

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ "آئینۂ انگریزی سوداگری" کا ذکر اب تک کی مطبوعات کی فہرست میں شامل نہیں۔ نہ اس کے شمارے کی مکمل فائل کا کچھ اتا پتا ہے۔ برٹش لائبریری میں اس کا جو سب سے پرانا شمارہ ملتا ہے وہ جنوری تا اپریل ۱۸۹۶ء کا ہے جس کی بنیاد پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کی اشاعت کا آغاز ۸۷-۱۸۸۶ء کے درمیان ہوا ہوگا۔

جریدہ مذکور ایک انگریزی کمپنی "گلبرٹ اینڈ ریونگٹن لمیٹڈ"، نے سینٹ جان ہاؤس کلرکن ول (CLERKENWELL) لندن سے جاری کیا تھا۔ یہ عام طور پر باون صفحات پر مشتمل ہوتا تھا اور اس میں زیادہ تر تجارتی چیزیں ہوتی تھیں۔ علاوہ ازیں اشتہارات

اور تصویری فیچر بھی ہوتے تھے۔ ہندوستان سے تجارتی تعلقات کی خبریں بھی نمایاں جگہ پاتی تھیں۔

جنوری تا اپریل ۱۸۹۶ء کے شمارے میں جس موضوع پر اڈیٹوریل لکھا گیا اس کا عنوان "انڈیا بھیجے جانے والے ٹیلیگرام کے محصول میں کمی" تھا۔ یہ اداریہ صرف تجارتی حلقوں کے لیے فائدہ مند نہ تھا بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی کارآمد تھا جو انگلستان میں آباد ہو گئے تھے۔

اس اردو جریدے کے صفحات پر ایجادات وانکشافات کی خبریں بھی اپنے مخصوص عنوان کے ساتھ ہوتی تھیں۔ ایک مضمون اس عنوان کے ساتھ شامل ہے "وہ گاڑی جو گھوڑے کی مدد کے بغیر چلتی ہے" کار کا ذکر کیا گیا ہے۔ چھ دوسرے مضامین ہندوستانی صنعت اور زرعی صورتحال کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس میں ایک مضمون ایسا بھی ہے جو ایران کے پٹرولیم کی تجارت سے بحث کرتا ہے۔ مزید برآں گورنمنٹ کی جانب سے انڈین سول سروس کے مقابلے کا ایک اعلان بھی ہے۔ اس پرچے کے جولائی ۱۸۹۷ء کے شمارے نے نیپال میں گوتم بدھ کی جائے پیدائش کی خبر دی ہے۔ ساتھ ہی کچھ صفحات کتابوں پر تبصرے کے لیے بھی مختص کیے گئے ہیں۔ اس شمارے کا تہائی حصہ مختلف اشیا، آلات، فرنیچر اور مشین کے اشتہارات سے بھرا ہے۔

اس جریدے میں ہندوستان کی سماجی اور سیاسی صورتِ حال پر کچھ نہیں ملتا۔ نہ اس کے مندرجات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ایڈیٹر کون تھا؟

جنوری تا اپریل ۱۸۹۶ء کے شمارے سے اس کے ایڈیٹر کی موت کی خبر فراہم ہو جاتی ہے۔ ایک شخص فریڈرک پن کاٹ پرچے کی اشاعت کی تاخیر کا ذکر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ پرچہ نئے ایڈیٹر کی تقرری کے بارے میں خاموش ہے۔

آج کے اردو اخباروں کے برعکس "آئینہ انگریزی سوداگری" ٹائپ میں شائع ہوتا تھا۔ ہر صفحہ دو کالموں میں تقسیم تھا۔ مضامین کی سرخیوں میں اردو کے ساتھ انگریزی بھی درج ہوتی تھی۔ انڈیا آفس لائبریری کے کیٹلاگ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ یہ پرچہ ۱۸۹۸ء کے بعد بند ہو گیا تھا۔

برٹش لائبریری کے کاغذات اور رکارڈ سے دوسرے کسی معاصر اردو جریدے کا پتا نہیں چلتا۔ البتہ "آئینہ انگریزی سوداگری" کی طرح ایک انگریزی جرنل "اینگلو اورینٹل ٹریڈ سمنجر" کا دوسرا شمارہ مطبوعہ جنوری ۱۹۰۱ء دستیاب ہے۔

اس انگریزی جریدہ کی اشاعت غالباً ۱۹۰۰ء کے شروع میں عمل میں آئی تھی۔ جس کا منشا برطانیہ اور مشرق کے مصنوعات فروخت کرنے اور مصنوعات بنانے والے کے درمیان رابطہ قائم کرنا تھا۔ یہ جریدہ انگریزی، یونانی اور بعض دوسری مشرقی زبانوں میں، جن میں ہندوستانی یعنی اردو بھی شامل ہے، شائع ہوتا تھا۔ اور مشرق کے خاص خاص شہروں کے تجارتی اداروں اور ایوان ہائے صنعت و تجارت، وہاں کے سرکاری دفاتر اور ان جہازراں کمپنیوں کو ارسال کیا جاتا تھا جن کے کاروباری جہاز بحرِ روم، بحرِ اسود، خلیج فارس اور ہندوستان آتے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں اس جریدے میں صنعتوں میں کام آنے والی مشینوں اور آلات وغیرہ کی اطلاعات بھی ہوتی تھیں۔ ایسے اندراجات بھی ہوتے تھے جن سے اشیا کی مروجہ قیمتوں کا بھی پتا چلتا تھا۔

یہ کارآمد جریدہ کب بند ہو گیا۔ اور کیوں جاری نہ رہ سکا اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔

گلہائے رنگ رنگ

پروفیسر عبدالخالق بلوچ

بلوچی شاعری کے مطالعے کی نوعیت

انسانی تہذیب کے عصر کے ابتدائی مرحلوں میں جو فنونِ لطیفہ بتدریج وجود میں آتے ہیں وہ فنون کے فنّی لوازمات کے پیشِ نظر مدوّن نہیں ہوتے۔ فنّی لوازمات تو ان سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ ان فنون میں معصومیت اور سادگی کے ساتھ بے ساختگی اور برجستگی ہوتی ہے۔ تہذیبی سفر کے ساتھ ساتھ ان فنون کا ارتقا ہوتا رہتا ہے۔ نقشِ ثانی نقشِ اوّل سے بہتر ہوتا ہے۔ فن پاروں میں تراش خراش کے ساتھ ساتھ جمالیاتی قدر زیادہ دامن کش ہوتی جاتی ہے۔ فنّی باریکیاں بڑھتی رہتی ہیں۔ معاشرے کے معاشی اور تہذیبی سفر کے ساتھ ساتھ فن بدلتی ہوئی قدروں کو بھی اپنے دامن میں جگہ دیتا ہے، ماحول کی عکّاسی کرتا ہے اور اس کے فنّی حُسن کو فروغ بھی دیتا ہے لیکن تہذیب جب چونچلوں کا سہارا لینے لگتی ہے تو فن میں تکلّف اور تصنّع پیدا ہونے لگتا ہے۔ کم و بیش تمام زبانوں کی شاعری سے اس کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

انسانی زندگی کے "پروہت کال" میں تخلیق ہونے والی شاعری نیم اساطیری اور مذہبی ہوتی ہے۔ اس میں متنِ زبان اور اسلوب کے لحاظ سے دھرم، مذہب یا عقیدوں کی چھاپ ہوتی ہے اور "سامنت کال" میں استحصال کرنے والے عناصر کے مفادات کے تحفظ کی کوشش ہوتی ہے۔

قبائلی معاشرے میں شاعری قبیلے کے سردار، اس کے اعزا و اقربا اور ذی مرتبہ افراد کے گرد گھومتی ہے یا معصومانہ انداز میں رسم و رواج، مشاغل اور تفریحات وغیرہ کی ترجمان۔ اس معاشرے میں بہادری، شجاعت، ہمت، غیرت، حمیّت، آزادی، مہمان نوازی، ایفائے عہد جیسی اقدار کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے شاعری میں ان سب کا عکس ملتا ہے۔ قبیلوں کی رقابت، پانی یا چراگاہ یا کسی غیرت یا حمیّت کی وجہ سے باہم نبرد آزمائی بھی شاعری کا موضوع ہوتی ہے۔ ہر قبیلہ میں "بھاٹ" بھی سردار کی مہمات اور دلیرانہ کارناموں کی نظمیں سُناتے ہیں۔ ان کی بدولت مختلف تاریخی اور نیم تاریخی واقعات منظوم ہوتے رہتے ہیں۔ ان نظموں کا رنگ قصیدوں جیسا ضرور ہوتا ہے اور بیان معروضی کم اور موضوعی زیادہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے نظم صحیح معنوں میں تاریخ نہیں بن پاتی۔ شاعری کے عام موضوعات عشق و محبّت، جنگ و جدال، شجاعت و حمیّت وغیرہ ہی ہوتے ہیں۔ زبان سادہ اور سلیس اور بیان میں بے تکلفی اور بے ساختگی ہوتی ہے۔ شاعری عشقیہ یا کسی قدر رزمیہ ہوتی ہے۔ عشق و محبّت کے واقعات منظوم ہو کر زبان زد ہوتے رہتے ہیں اور لوک گیت کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ زبان ضبطِ تحریر میں نہ آنے کی وجہ سے شعری سرمایہ نسل در نسل، سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہتا ہے۔

اور اس طرح کی منتقلی میں کچھ نہ کچھ لسانی تغیّرات کا امکان بھی ہوتا ہے۔

اگرچہ بلوچی زبان بہت قدیم زبان ہے، ادستائی عہد سے اس کے ڈانڈے ملتے ہیں لیکن ضبطِ تحریر میں نہ آنے کی وجہ سے اس کا شعری سرمایہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا آیا ہے اور اس کا امکان ہے کہ ایک بڑا سرمایہ سینوں میں بھی محفوظ نہ رہ سکا ہو۔ تاہم جتنا سرمایہ بھی نسل در نسل منتقل ہوتا آیا ہے وہ سب ضبطِ تحریر میں نہیں آسکا ہے۔ قدیم بلوچی شاعری کا اچھا خاصا حصّہ منتظر ہے کہ تخلیق کار اور عہدِ تخلیق کی تحقیق کی جائے، لسانی تجزیہ کیا جائے اور بلوچی زبان کے ارتقائی سفر کے نقوش مرتّب کیے جائیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ قومی ہیروؤں کے کارناموں کے اشعار میں جو مکالمے ملتے ہیں ان کی بنیاد پر ہر قومی ہیرو کو شاعر قرار دینا محلِّ نظر ہے۔ "شاہنامہ" میں رستم کے مکالمے پڑھ کر رستم کو شاعر قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن ہم فرطِ محبّت سے مغلوب ہو کر اپنے قدیم شاعروں کی فہرست تیار کرتے وقت اس حقیقت کو بھلا بھی دیتے ہیں۔

زبان چوں کہ ثقافت کے بہت سے پہلوؤں کی منہ بولتی تصویر ہوتی ہے اور ثقافتی ورثہ سمجھی جاتی ہے اس لیے ہم اس سے اور اس کے ادب سے والہانہ محبّت کرتے ہیں لیکن یہ والہانہ محبّت ہمیں تحقیق و تدقیق سے نہیں روکتی بلکہ اس کا اقتضا تو یہ ہے کہ ہم پوری لگن سے تحقیق و تدقیق کریں اور زبان و ادب کے گمنام گوشوں کو تلاش کر کے متعارف کرائیں۔ ان کے پردے میں اپنی تہذیب و ثقافت کی کہانیوں کو دیکھیں اور اپنے تہذیبی سفر کے نقوش کی نشاندہی کریں۔ اپنی تہذیبی اقدار کو اُجاگر کریں۔ لسانی نیرنگیوں، انحرافات اور تغیّر و تبدّل کو سمجھیں، ان کی توجیہہ کریں اور لسانی و تہذیبی اخذ و استفادہ اور افادے کی تحقیق کریں۔

پندرہویں صدی کے بعد کے ابتدائی کلام کے خالقوں کی دریافت تو تقریباً ناممکن ہے تاہم جو شاعری ضبطِ تحریر میں آئی ہے اور جن کے بعض حصّوں کے اشعار میں ترامیم یا اضافے یا اختلافات ہیں، ان کی توجیہات کریں اور اصل کلام کو کھنگال کر منظرِ عام پر لائیں۔ تخلیق کاروں کے سلسلے میں جو غلط روایات قائم ہو چکی ہیں ان کی جانچ پڑتال کریں۔ اس سلسلے میں سید ہاشمی مرحوم کے اشارے خاصے وزنی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہاشمی خود بھی موضوعاتی نقطۂ نظر اختیار کر لیتے اور جذباتی ہو جاتے ہیں اور ماحول کی تبدیلیوں کے اثرات کی مخالفت میں انتہائی مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ دوسری طرف شیر محمد مری سندھی اور سرائیکی سے متاثر بلوچی زبان اور بعض آوازوں کو بنیادی اہمیت دے کر لسانیات کے ایسے موضوعات پر خامہ فرسائی سے بھی دریغ نہیں کرتے جن کے متعلق لسانیاتی پس منظر اور لسانیات کے بنیادی علم کی ضرورت ہے۔ ان کے یہاں بھی جذباتیت غالب نظر آتی ہے۔ قدیم بلوچی شاعری کے سلسلے میں ضروری کام قدیم شعرا کے تشخّص اور ان کے عصر کے تعیّن کا ہے۔ جس کے لیے قدیم شاعری کے متن کے غائر مطالعے اور داخلی شہادتوں کی تنسیخ کی ضرورت ہے۔ دیگر عصری دستاویزات سے شہادتیں حاصل کرنے یا تاریخ سے رجوع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ عصری دستاویزات ناپید۔ اور تاریخ تشکیلِ جدید کے مرحلوں سے اب تک گزر رہی ہے اور خود ہی قدیم شاعری کی محتاج رہی ہے۔ لیکن قدیم شاعری تاریخ کو غلط راستے پر بھی ڈالتی رہی ہے۔ مثلاً بلوچوں کو امیر حمزہؓ کی اولاد بتانا، حلب سے ہجرت کرنا وغیرہ۔ کلام یا روایات صدیوں تک سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں تو ان میں الحاقات، انحرافات، متن اور زبان کی تبدیلیوں کے امکانات بھی ہوتے ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

قبائلی تہذیب میں ہر قبیلے کے "بھاٹ" یا شاعر، قبیلے کی معاشرتی زندگی، حالات اور واقعات کو نظم کرتے رہے یا نثر

میں بیان کرتے آئے ہیں ان بیانات میں واقعیت ضرور ہوتی ہے۔ لیکن سردار کی خوشنودی اور اہلِ قبیلہ کی تسکین اور محبت کی غرض سے رنگ آمیزی اور موضوعیت بھی ہوتی ہے اور اصلیت سے انحراف بھی۔ اس لیے انھیں تاریخی صداقت نہیں کہا جاسکتا۔ تاہم ان کے عمری اشعار و بیانات سے تقابلی اور اندرونی شہادتوں کی چھان پھٹک سے تاریخ کا انبساط ضرور کیا جاسکتا ہے۔ بلوچی شاعری اور داستانیں بھی اسی نقطۂ نظر سے زیرِ مطالعہ ہوں اور ان کی تنقیح اور چھان پھٹک کی جائے تو بلوچ معاشرے اور مختلف قبائل کی اور بلوچی شاعری اور کہانیوں کی تاریخ اور بلوچی زبان کے ارتقا کی مختلف منزلیں نظر کے سامنے آسکتی ہیں۔

ابنِ انشا کی حیات اور کارناموں پر ایک اہم دستاویز

ابنِ انشا

احوال و آثار

مصنّف

ڈاکٹر ریاض احمد ریاض

صفحات: ۹۶۶ ــــــ قیمت: ۱۵۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ، کراچی

گلہائے رنگ رنگ

گجراتی کہانی

ونود بھٹ / شاہین فاطمہ

عجیب انسان

آپ اگر ستائیس نمبر کے بس اسٹاپ پر کھڑے ہوں گے تو آپ کو اپنے بازو میں ایک صاحب پان چباتے ہوئے ملیں گے۔ آپ نے ذرا ان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہ بڑی اپنائیت سے پوچھیں گے۔ "ستائیس نمبر آگئی؟"

آپ انکار کریں گے، کیوں کہ اگر وہ بس آگئی ہوتی تو آپ اس میں بیٹھ کر چلے گئے ہوتے اور جواب دینے سے بچ جاتے۔

"آپ غالباً اخبار میں کالم لکھتے ہیں؟" وہ پوچھتے ہیں

آپ حیرت سے ان کو دیکھنے لگتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ واقعی یہ دنیا کتنی چھوٹی ہے۔

"ویسے تو جناب میں نے بھی خوب لکھا ہے..." یہ جان کر آپ کی حیرت دوگنی ہو جاتی ہے۔

آپ اب ان شانتی لعل کو جب بھی بس اسٹاپ پر دیکھتے ہیں تو ایک خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک گتھیا کا مریض دوسرے گتھیا کے مریض سے مل کر خوشی محسوس کرتا ہے۔

ستائیس نمبر کے اسٹاپ پہ اب آپ کو شانتی لعل کو دیکھنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔

شانتی لعل آج بس اسٹاپ پر دکھائی نہ دیے۔ فوراً ان کی یاد آپ کو آگئی۔ آپ سوچتے ہیں، کل بھی شاید وہ دکھائی نہیں دیے تھے کہیں انھیں کچھ ہو تو نہیں گیا؟

آپ اپنے دفتر میں جیسے ہی داخل ہوئے، چونک پڑتے ہیں۔ سامنے کرسی پہ بیٹھے شانتی لعل پان چبا رہے ہیں۔

"بھائی شانتی لعل جی آپ!" حیرت سے آپ نے پوچھا۔ شانتی لعل نے بڑے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"آپ سے کچھ کام پڑ گیا ہے۔"

"فرمائیے۔" آپ سنجیدگی سے پوچھتے ہیں۔

وہ کچھ بولے بغیر منہ کا پان چباتے رہتے ہیں... جب کہ آپ کو ان کی بات سننے کی عجلت ہے۔

کچھ دیر بعد وہ اپنا منہ کان کے پاس لاکر کہتے، "کیا وقت ہوا ہے؟"

"دس بجے ہیں۔" آپ جواب دیتے ہیں اور پھر سوچتے ہیں، یہ شریف آدمی کیا صرف وقت پوچھنے کے لیے ہی اتنی دور سے آیا ہے؟

"دوست، مجھے ایک ہزار روپے کی سخت ضرورت ہے..... اور زہر کھانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں....."

"زہر کیا اتنا مہنگا ہو گیا ہے؟" آپ سوچنے لگتے ہیں۔ شانتی لعل کی آنکھوں میں بڑی التجا تھی جو سیدھے دل میں اُتر گئی۔
یہی آپ کی کمزوری ہے۔ مگر اس وقت تو آپ کے پاس اتنے روپے ہیں نہیں۔ ہاں، آپ کے اسکوٹر کا سودا آج ہی کل میں ہونے والا ہے۔
اس رقم میں سے آپ ایک ہزار روپے شانتی لعل کو دینے کا فوراً فیصلہ کر لیتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ اس وقت تو میرے پاس اتنے روپے نہیں ہیں مگر میں کوشش کرتا ہوں۔ آپ ایک دو روز بعد ملیں۔

"اچھا، میں منگل کو آؤں گا۔" یہ کہہ کر شانتی لعل روانہ ہو گئے۔
منگل کے روز آپ کے دفتر پہنچنے سے قبل ہی وہاں شانتی لعل بیٹھے آپ کی راہ دیکھ رہے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی آپ کو خیال آیا کہ اسکوٹر کا سودا تو ہوا ہی نہیں۔ شانتی لعل آپ کے بیٹھنے کا انتظار نہیں کرتے۔

"کہیے جناب کچھ انتظام ہوا؟"
مایوسانہ انداز میں آپ کہتے ہیں۔ "نہیں بھئی ابھی نہیں ہو پایا۔"
"بھائی صاحب ایسے کام نہیں چلے گا۔ آپ کے بھروسے پر میں نے قرض خواہوں سے آج کا وعدہ کیا تھا۔ اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں۔ جیسے بھی ہو آپ دو دن کے اندر روپے کا انتظام کر دیجیے، سمجھ گئے آپ، میں جمعرات کے دن پھر آؤں گا۔"
یہ کہہ کر وہ پھر چلے جاتے ہیں۔
جمعرات کو بھی شانتی لعل دفتر میں آپ سے قبل ہی داخل ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ جب آپ ان کو اپنے آگے دیکھتے ہیں تو ایک منٹ کے لیے آپ کا دل چاہتا ہے کہ واپس لوٹ جائیں لیکن ایسا ہو نہیں پاتا۔
نظر ملتے ہی وہ پوچھتے ہیں۔ "کچھ انتظام ہوا۔" آپ نفی میں سر ہلا دیتے ہیں۔
"ایسے کام نہیں چلے گا جناب۔ سو پچاس کم دے دیں، مگر آپ آج فارغ ہی کر دیں۔"
"بھائی شانتی لعل میرے پاس واقعی روپے نہیں ہیں۔" آپ نے افسردہ لہجے میں کہا۔
"اچھا، دو دن کی میعاد اور دیتا ہوں۔"
ہفتے کو آپ کے بولنے سے قبل ہی شانتی لعل گلا پھاڑ پھاڑ کر چلّانا شروع کر دیتے ہیں: "آج تو میں کچھ نہ سنوں گا۔ مجھے تو بس روپے چاہییں ہیں روپے۔"
آپ کے پاس بیٹھے سب لوگ سوچتے ہیں کہ شانتی لعل ضرور قرض خواہ ہے اور آپ اس کے مقروض اسی لیے آپ اسے بار بار دوڑا رہے ہیں۔ اب تو خود آپ کو بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہونے لگا ہے۔
"آخر اس میں سوچنے کی کون سی بات ہے۔"
"میں سوچ رہا ہوں کہ ایک ساتھ اتنی بڑی رقم کہاں سے دوں؟"
"یہ سوچنا آپ کا کام ہے۔" پھر نرم لہجے میں بولے۔ "ابھی پورے نہیں دے سکتے ہو تو سات سو ہی دے دو۔ فی الحال اتنے سے کام چلا لوں گا۔ اور کیا کہوں، منگل کو آؤں گا۔"
منگل پھر جلدی آ گیا۔ آپ کی آنکھوں کی لاچاری پڑھ کر شانتی لعل بولے۔

"میں جانتا تھا کہ آج بھی کچھ انتظام نہ ہوا ہوگا۔ دیکھیے آپ کی بات بھی رہ جائے اور میری بھی۔ چلیے پانچ سو دے دیجیے، جان چھوٹے۔

"پانچ سو روپے ......"

"اچھا چھوڑیں تین سو ہی دے دیں۔ مگر اب ٹالیے گا نہیں" جمعرات کو پھر آنے کی بات کہہ کر شانتی لعل چلے گئے۔

جمعرات کو شانتی لعل آپ کے سامنے بیٹھ کر کُرتے کی آستینیں چڑھا رہے ہیں۔

آپ ان سے آنکھیں چار نہیں کر سکتے اس لیے وہ خود ہی بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ "آپ کے وعدوں سے تنگ آگیا ہوں مگر آج ارادہ کر لیا ہے کہ روپے لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

جواب میں آپ فوراً کہتے ہیں کہ "میرے پاس تو تین سو روپے کبھی نہیں ہیں۔"

"کچھ سمجھ میں تو آئے کہ آپ کیا دیں گے؟ جلدی بولیں، میرے پاس وقت کم ہے۔"

آپ ان کو نظر بھر کے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں۔ "اچھا... سو ہی دے دیں لیکن وہ وعدہ پکا ہونا چاہیے۔ بولیں کب آؤں۔"

"جب آپ کو آسانی ہو۔"

"ہفتے کو؟" ...... "ٹھیک ہے..... ہر ہفتے کو آجایا کریں"۔ آپ مزاحاً کہتے ہیں۔

شانتی لعل آپ کے مزاح کو سمجھ کر بھی نہ سمجھنے کی اداکاری کرتے ہیں ــ "اچھا میں ہفتے کو آؤں گا۔

اب آپ ان کو چڑھانے کا ارادہ کرتے ہیں۔

جب ہفتے کو بھی آپ وعدہ پورا نہیں کرتے تو شانتی لعل منہ لگا کر کہتے ہیں۔

"آدمی تو میں نے بہت دیکھے ہیں مگر آپ جیسا لپاڑی نہیں۔ خیر صاف صاف سنیئے مجھے یہ لپاڑی پن بالکل پسند نہیں۔ شام تک مجھے دو سو روپے...... اور نہ ہوں تو سو ہی دے کر جان چھوڑیں۔ شام کو پانچ بجے آؤں گا۔"

شانتی لعل کو دوڑانے اور ٹالنے میں اب آپ کو مزا سا آنے لگا تھا۔ شانتی لعل کو مزید چڑھانے کے لیے آپ ایک لفافے میں صرف دس روپے کا ایک نوٹ رکھ کر لفافہ بند کر دیتے اور لکھتے ہیں۔ "شانتی لعل کے لیے۔"

شانتی لعل وقت کے بڑے پابند ہیں۔ وہ ٹھیک پانچ بجے آپ کے دفتر پہنچ جاتے ہیں۔ آپ وہ لفافہ ان کے ہاتھ میں پکڑا دیتے ہیں۔

وہ پوچھتے ہیں۔ "میں تے جتنے کہے تھے اتنے ہی ہیں؟"

آپ مسکرا کر جواب دیتے ہیں۔ "جتنے مجھے دینے تھے وہ اس لفافے میں ہیں..... اور یہ مجھے واپس بھی نہیں لینے ہیں۔"

شانتی لعل آپ کے سامنے ہی لفافہ کھولتے ہیں... دس روپے کا ایک نوٹ دیکھ کر وہ ذرا بھی جھنجلاتے نہیں۔ وہ لفافہ آپ کے سامنے پھاڑ کر پھینک دیتے ہیں لیکن دس روپے کا نوٹ اپنی جیب میں رکھنا نہیں بھولتے۔

"آپ نے میری بڑی بے عزتی کی ہے۔" یہ کہہ کر شانتی لعل پیر پٹختے ہوئے دفتر سے چلے جاتے ہیں۔

اب شانتی لعل آپ کو تائیس نمبر کے بس اسٹاپ پر دکھائی نہیں دیتے۔ ہاں ایک بار آپ نے انھیں دو نمبر کے بس اسٹاپ پر کسی اجنبی سے بڑی اپنائیت سے یہ پوچھتے دیکھا۔ "دو نمبر گئی؟"۔

آپ پر یک بیک نظر پڑتے ہی انھوں نے یوں منہ موڑا جیسے جانتے ہی نہیں

گلہائے رنگ رنگ

سندھی

شاہ لطیف / آفاق صدیقی

وائی

وہ دلدار طبیب دارو میرے درد کی

پل بھر میں دکھ درد مٹا دے اس کا قرب عجیب

وہ دلدار طبیب

آپ ہی آکر دیکھے بھالے میرا حالِ غریب

وہ دلدار طبیب

دُور ہوئی ہر بپتا میری مجھ کو ہوا نصیب

وہ دلدار طبیب

سکھیوں! شاہ لطیف کہے کامل مرا حبیب

وہ دلدار طبیب

دارو میرے درد کی اس کا قرب عجیب

وہ دلدار طبیب

گلہائے رنگ رنگ

سرائیکی

خواجہ غلام فرید/آفاق صدیقی

کافی

میرا عشق بھی تو میرا یار بھی تو
میرا دین بھی تو ایمان بھی تو

میرا جسم بھی تو میری روح بھی تو
میرا قلب، جگر اور جان بھی تو

میرا قبلہ، کعبہ، دیر، حرم
میرا مصحف اور قرآن بھی تو

میرا تقویٰ، زہد و عبادت تو
میرا اسلام بھی تو عرفان بھی تو

میرا ذکر بھی تو میرا فکر بھی تو
میرا ذوق بھی تو وجدان بھی تو

میرا مرشد ہادی پیر بھی تو
میرا شیخ حقائق دان بھی تو

میری خوشیوں کا اسباب بھی تو
میرے جینے کا سامان بھی تو

کیا دیکھوں بھالوں اور پرکھوں
میری سوچ سمجھ اور گیان بھی تو

میرا دکھ سکھ رونا ہنسنا تو
میرا درد بھی تو درمان بھی تو

جو یار فرید قبول کرے
سرکار بھی تو سلطان بھی تو

گلہائے رنگ رنگ

پنجابی

نذیر قیصہ / رفیق احمد نقش

عمریں بیت گئیں

پھر وہ مہینہ نہ برسا، کھو گئے برس کئی
پھر وہ رات نہ آئی، عمریں بیت گئیں
پھول نے پر پھیلائے، موسم بیت گیا
ہوا نے شاخ ہلائی، عمریں بیت گئیں
دیکھا تھا کوئی سپنا، تارے ٹوٹ گئے
اور پھر نیند نہ آئی، عمریں بیت گئیں
دور کہیں افلاک پہ سورج ڈوب گیا
کونج کوئی کرلائی، عمریں بیت گئیں

پہلا حرف

میرے اندر میں نہیں بستا
کوئی وہی
رہتا ہے
جس کے نام کا
پہلا حرف میں جانتا ہوں
پر اس حرف کا
مطلب مجھے نہیں آتا

امام حسین

چار اطراف سے
پھیلتے ہوئے
لاکھوں خالی ہاتھ
نیزے اوپر
ٹنگا ہوا
پھولوں کا اک ہار

خوابوں والی بیل

نیچی ہوتی جائے بتی
گھٹتا جائے تیل
پھر بھی پھول کھلاتی جائے
خوابوں والی بیل

جنگ کے بعد دعوت

کہو گدھوں سے
شہر ہمارے بھی آئیں
ننگے فلک کے نیچے
دھرتی ماں کی
لہو میں بھیگی
چھاتی پر
پڑی ہوئی لاشیں کھائیں
کہو گدھوں سے
شہر ہمارے بھی آئیں

گلہائے رنگ رنگ

عربی کہانی

فردوس سبار/ قطب اللہ

اصحابِ کہف

زمانہ کتنا آگے بڑھ گیا تھا۔ اسے کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ بے خبر پڑا سو رہا تھا، لیکن جب نیند سے بیدار ہوا تو سب سے پہلے جس چیز کا احساس ہوا وہ زمانہ اور وقت تھا جو اب رُکے ہوئے تھے، بالکل جامد۔ شاید وقت منجمد ہو جانے کی وجہ سے ہی وہ جاگ گیا تھا۔

اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کی، اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ دور دور تک اندھیرے کا راج تھا، وہ شاید کسی اندھے کنوئیں میں ڈوب رہا تھا۔ اک دم گھبرا کر اٹھ بیٹھا، کانپنے لگا... ارے قیامت تو نہیں آگئی؟ رحم کرنا میرے اللہ ..... اس نے ڈرتے ڈرتے اٹھنے کی کوشش کی۔ اب اسے اس بات کی سخت فکر تھی کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟ ہاتھوں کو بڑھا کر دیواروں کو ٹٹولا تو ایسا لگا کہ ان سے خون ٹپک رہا ہو۔ پتھریلی دیوار پر بہت سے چہرے لٹک رہے تھے۔ انھیں اپنی انگلیوں کی آنکھوں سے وہ صاف صاف دیکھ رہا تھا۔ یہ سب کیا ہے؟ وہ کھڑے ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ آخر مجھے بھی تو معلوم ہو کہ یہ سب .... پوری طرح کھڑا نہیں ہو پایا تھا کہ اس کا سر چھت سے ٹکرا گیا۔ ہوں ..... تو یہ بات ہے۔ اب میں سمجھا میں کسی غار میں ہوں۔

اس نے روشنی ٹٹولنا شروع کیا تو اس کے ہاتھوں میں جھرجھری سی آگئی، کوئی چیز ان سے آکر لگی تھی۔ پھر چھو کر دیکھا، ہوں، ..... یہ روشنی ہی تو ہے، اس نے غار کے دہانے سے سر باہر نکالا تو عجیب و غریب منظر دیکھا۔ لوگوں کے چہرے بدل گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں اب سہارے کی لکڑی نہیں تھی اس کی جگہ بندوق نے لے لی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ "چلو چل کر سوتے ہیں"۔ لیکن دیواروں سے تو خون ٹپک رہا ہے۔ غار اب بھر جائے گا۔ خون کی نکاسی کے لیے کوئی نالی بھی تو نہیں ہے۔ خون کے تصور سے اس کے ہاتھ پاؤں برف ہونے لگے، اس کا سر جلنے لگا، اس نے محسوس کیا کہ اس کا جسم پھول رہا ہے، تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اسے خطرہ لاحق ہو گیا کہ جسم کہیں غار کے حجم سے بڑھ نہ جائے۔ وہ پوری قوت سے چیخ پڑا۔

کیا میں اپنی پوری زندگی اسی غار میں گزار دوں؟ آواز تیرتی ہوئی نہ جانے کہاں چلی گئی، شاید چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی تھی۔ اسی لیے تو کسی نے جواب نہیں دیا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔

نہیں نہیں، میں اس طرح نہیں جی سکتا! میرے چاروں طرف خون رینگ رہا ہے۔ اندھیرا ہے۔ مجھے سورج سے بات کرنی ہو گی۔ آخر وہ مجھے سیب کے باغ میں جانے کیوں نہیں دے رہا ہے؟ سنا ہے وہاں خوشی اور آزادی کے بڑے عمدہ پھل ہوتے ہیں۔

اٹھ کر ایک طرف چلنے کی کوشش کی تو نظروں میں ہزاروں سرد قص کرنے لگے۔ غار سے باہر کی دنیا ایک جزیرہ میں قید تھی۔ سبزہ تو بس نام کو تھا، چھونے کی کوشش کی تو ہاتھ جل گئے۔ ہونہہ، عجیب جگہ ہے۔ تھک کر بیٹھ گیا اور ساحل کے نرم نرم سیلنے پر سوار سورج کو گھورنے لگا۔ اس روشنی اور گرمی میں میرا کتنا حصّہ ہے؟ وہ پوچھ رہا تھا۔ لیکن جواب کون دیتا، وہ تو آگ کا گولہ ہے۔ پھر اس طرح کے غاروں میں جہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے ان کے بارے میں کچھ فکر ہے کسی کو کیا۔ وہاں ذرا سی گرمی اور روشنی نہیں بھیجی جا سکتی ہے؟

اچانک اٹھ کر وہ پھر غار میں رینگ گیا اسے کچھ یاد آگیا تھا اندر داخل ہوتے ہی دیواروں سے ٹکرا گیا تھا۔ اسے شدید درد کا احساس ہوا، اس لیے پھر روشنی کی طرف بھاگا۔ غار کے دھانے پر کھڑے ہو کر پھر صدا لگائی۔

ارے کوئی ہے ..... ؟ سنتے ہو، میں کیا کہہ رہا ہوں؟ میں یہاں سے باہر نکلنا چاہتا ہوں، مجھے بھی سورج کی گرمی چاہیے۔ میری پیشانی پر پسینہ جم گیا ہے، اس کا بہنا بہت ضروری ہے۔ اُف ..... ان درختوں کی تازگی میں نچوڑنا چاہتا ہوں۔ دریا کی موجوں پر سوار ہو کر اس جزیرہ میں پہنچنا چاہتا ہوں جہاں سورج روشنی اور گرمی بانٹتا ہے۔ میں بھی وہاں کچھ بانٹنا چاہتا ہوں میرے پاس ایک خزانہ ہے۔ میں ننھی معصوم آنکھوں میں اس خزانے کو انڈیل دینا چاہتا ہوں۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ بس دو چار پیار کی سطریں لکھ کر دیدو تا۔

وہ کھڑا اپنا مدعا بیان کر رہا تھا۔ نہ جانے اتنی بھیڑ کہاں سے اکٹھی ہو گئی تھی۔ کوئی کچھ بول نہیں رہا تھا۔ سب بت بنے کھڑے اسے گھور رہے تھے۔ اس نے گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ وہ جزیرہ میں جانے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ لوگوں کا ہجوم جو ابھی تک پتھر بنا کھڑا تھا اس پر ٹوٹ پڑا۔ مار پیٹ کر، لاتوں کی بارش کر کے اسے پھر اسی غار کے اندر جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ بے سُدھ ہو کر گر پڑا۔ اور جب ہوش آیا تو چاروں طرف سناٹا تھا۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ارے، کیا لوگ چلے گئے؟ مجھے ان سے بہت ضروری باتیں کرنی تھیں۔

ایک بار پھر خوشی کی ایک لہر اس کے چہرے پر کھیلنے لگی، باہر سے کچھ آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے پھر سر نکال کر باہر جھانکا تو دیکھا کہ لوگ ہاتھوں میں لذیذ پکوان، انواع اقسام کے کھانوں کی قابیں لیے کھڑے تھے۔ اس کے نتھنوں میں خوشبو کا ایک طوفان امنڈ آیا تھا۔ لوگوں نے اس کے سامنے بڑے ادب سے کھانے سجا دیے۔ اس کے پہننے کے لیے عمدہ عمدہ لباس جو ساتھ لائے تھے غار میں ڈال دیے انھیں اس بات کا احساس تھا کہ جو کپڑے وہ پہنے ہوئے ہے اس پر خون کے دھبے ہیں، یہ کسی کو نظر نہیں آنا چاہیے۔

اسے بھوک بری طرح ستا رہی تھی۔ دل چاہا کہ قابوں پر ٹوٹ پڑے، لیکن رُک گیا۔ دیواروں سے خون اب بھی ٹپک رہا تھا، وہ پوری قوت سے چیخ پڑا۔ مجھے کھانے اور یہ کپڑے نہیں چاہیے۔ مجھے یہاں سے نکلنے دو، میری مدد کرو، میں باہر آنا چاہتا ہوں۔

کسی نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی۔ ہاں، اس کی اس خواہش پر لوگ پریشان ضرور نظر آنے لگے تھے۔

اس نے پھر اندھیرے میں ٹٹولا۔ خون، اُف غار بھر رہا ہے۔ وہ خون میں ڈوب کر دم نہ توڑ دے، اس نے اپنے دل کو

ٹٹولنا شروع کیا۔ اپنی جگہ دل ٹھیک طرح سام کر رہا تھا، لیکن اس میں یہ کیا؟ ارے، ایک چھوٹا سا سورج تو یہاں بھی موجود ہے۔ وہ خوشی سے ناچنے لگا، میرے دل میں۔۔۔۔۔ لوگو! سنتے ہو مجھے اب تمہاری خوشامد نہیں کرنی ہے۔ اب تو میں غاروں کے اندھیروں کو پی جاؤں گا۔ اس چنگاری سے تمہارے ہرے بھرے جزیرے کو جلا سکتا ہوں۔ میرا خواب شاید پورا ہو جائے۔

پکوان اس کے سامنے سجے رکھے تھے۔ ان سے بڑی خوشبودار بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس نے بغیر وقت ضائع کیے ایک لات ماری اور قابیں دیواروں سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئیں۔

ٹھیک ہے۔۔۔۔ میں تمہارے جنت نما جزیرے کی خبر جلد لوں گا۔ اور ہاں، سورج سے بھی پوچھوں گا کہ کتنی گرمی اور روشنی ہے اس کے پاس؟

ڈاکٹر انور سدید کی نئی کتاب

اُردو ادب کی تحریکیں

امیر خسرو سے لے کر عہدِ حاضر تک اُردو ادب کی اہم تحریک کا تجزیہ۔
اس کتاب پر مصنف کو پنجاب یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی۔
یہ کتاب سی ایس ایس کے امتحان اور ایم اے اُردو کے چوتھے پرچے کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔

چند مندرجات

ریختہ کی دو تحریکیں — ایہام کی تحریک — اصلاحِ زبان کی تحریک
علیگڑھ تحریک — فورٹ ولیم کالج — انجمن پنجاب کی تحریک
رومانوی تحریک — ترقی پسند تحریک — حلقۂ اربابِ ذوق
اقبال کی تحریک — اسلامی ادب کی تحریک — ادبی ثقافتی تحریک

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اُردو پاکستان، بابائے اُردو روڈ۔ کراچی ۱

رفتارِ ادب

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

مولانا محمد سورتیؒ

مصنفہ : فرزانہ لطیف

صفحات : ۲۰۶ — قیمت :

پتا : ندوۃ المحدثین — ۱۳، اسلام آباد — گوجرانوالہ

علامہ محمد بن یوسف سورتیؒ بہت بڑے عالمِ دین، عربی زبان کے ادیب، ماہر لسانیات اور نامور مدرّس تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا طویل عرصہ علم و ادب اور دین کی خدمت میں گزارا تھا۔ ان کا تذکرہ مختلف کتابوں میں ہے، ان پر متعدد مضامین لکھے گئے تھے۔ لیکن ان کے متعلق بیشتر حالات و معلومات ابھی تک ان کے عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں کے سینے میں تھیں۔ فرزانہ لطیف نے اپنے ایم۔اے کے مقالے کے سلسلے میں ان تمام مآخذ سے استفادہ کر کے نہ صرف ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی بلکہ ایک نہایت عمدہ تصنیف کا اردو میں اضافہ کیا ہے۔ اور اب ندوۃ المحدثین گوجرانوالہ نے اسے شائع کر کے ایک اور علمی خدمت انجام دی ہے۔

اس کتاب کی خاص بات یہ بھی ہے کہ اس کا پیش لفظ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری کے قلم سے نہایت دل آویز اسلوب میں ہے۔

کتاب سفید کاغذ پر چھپی ہے، پیپر بیک میں ہے اور اہلِ علم اور شائقین کے لیے سرمۂ مفت نظر کی مثال ہے

عروجِ اقبال

محقق و مصنف : پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

صفحات : ۲۳۴ — قیمت : ۱۲۰ روپے

پتا : بزمِ اقبال، لاہور۔

پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ نامور محقق اور بلند پایہ مصنف ہیں۔ ان کی تحقیق کے معیار اور تالیف و تدوین کے عمدہ ذوق کا علمی حلقے میں عام طور پر اعتراف کیا گیا ہے۔ حضرت علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کے افکار سے انھیں خاص تعلق رہا ہے۔ اقبالیات کے میدان میں وہ اس سے قبل شذراتِ فکرِ اقبال کے نام سے اقبال کی ایک کتاب کا ترجمہ کر کے اور اس پر حواشی لکھ کر اور ایک بلند پایہ مقدمہ لکھ کر علمی و تحقیقی دنیا سے، خصوصاً اقبال کے شیدائیوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔

اب ان کا تازہ شاہکار تحقیق "عروجِ اقبال" کے نام سے بزمِ اقبال نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے حضرت اقبال کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کے ارتقا کا دور بہ دور جائزہ لیا ہے۔ وہ اپنی تحقیق میں ابھی ۱۹۰۸ء تک پہنچے ہیں۔ اور یہ دور جیسا کہ معلوم ہے

اقبال کی شخصیت اور فکر و فن کا تشکیلی دور ہے۔ اس دور میں ان کی شخصیت اور ملی شاعری کی بنیادیں تو ضرور فراہم ہو گئی تھیں لیکن ان کی عظیم الشان مفکرانہ و فلسفیانہ اور اسلامی شخصیت اور فکر و فن کی پختہ و مستحکم عمارت بعد میں تعمیر ہوئی ہے۔

یہ کتاب تین ابواب (۱) شخصیت اور سیرت کی بنیادی تشکیل (۲) متنوع رجحانات میں شخصیت کی اکائی (۳) ذہنی انقلاب ۱۹۰۵ء۔ ۱۹۰۸ء ___ اور نو فصول میں تقسیم کی گئی ہے۔ مطالب کی علمی ترتیب اور مباحث کی تالیف کی بنا پر ہر باب ایک مستقل تصنیف اور تحقیق کے شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے بقول، آیندہ جو کوئی بھی اس موضوع پر لکھنا چاہے گا اس کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ٹھہرے گا اور یہ کہ اقبال کی شخصیت اور فکر و فن کے متعلق یہ کتاب ایک اچھی خاصی انسائیکلو پیڈیا بن گئی ہے۔

کتاب سفید کاغذ پر ٹائپ میں چھپی ہے۔ سائز بڑا ہے۔ مجلد ہے اور سادہ ڈسٹ کور چڑھا ہوا ہے۔ ۱۲۰ روپے قیمت مناسب ہے۔

کتابِ دوستاں ___ مصنّف: حکیم محمد سعید

صفحات: قیمت: ۳۰ روپے

پتا: ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، ناظم آباد کراچی ۷۴۶۰۰

بچوں سے ان کی عقل، آرزوؤں اور اُمنگوں کے مطابق ہم کلام اور مخاطب ہونا بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن یہ کام جناب محترم حکیم محمد سعید ایک مدت سے احسن طریقے سے سرانجام دے رہے ہیں۔ وہ ہر ماہ ہمدرد نونہال اور نونہالوں کی دل چسپی کے موضوعات پر سادہ زبان اور دل چسپ انداز میں حکمت اور تجربے کی باتیں لکھتے ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں اسلامی علم و ثقافت کا نچوڑ ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ کالم خاص طور پر نونہالوں کے لیے ہوتا ہے، لیکن بڑے بھی اسے پڑھ کر اتنے محظوظ ہوتے ہیں جتنے کہ نونہال۔

جناب محترم حکیم محمد سعید کے ان بے شمار لعل و جواہر کو جو ہمدرد نونہال کے اوراق میں بکھرے پڑے ہیں۔ جناب مسعود احمد برکاتی نے چن کر ایک خوبصورت لڑی میں پرو کر "کتابِ دوستاں" کے نام سے مرتّب کر دیا ہے۔ ان تحریروں میں آفاقی حقیقتوں، پاکستان کی محبت، نونہالوں کی سطح کے مسائل اور حکمت و دانش کی باتیں سادہ اور آسان زبان میں پیش کی گئی ہیں۔ اندازِ بیان دل کش ہے۔

یہ کتاب ہمدرد فاؤنڈیشن نے رنگین ٹائیٹل کے ساتھ رنگین اوراق اور عمدہ کاغذ پر شائع کی ہے اور اس قابل ہے کہ بچوں کو ان کی سال گرہ کے موقع پر تحفے کے طور پر پیش کی جائے۔

جناب محترم حکیم محمد سعید نے اس کتاب کی نقل و اشاعت کے جملہ حقوق عام کر دیے ہیں اور یہ کتاب اس لائق ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے۔

اک رشتۂ غم ___ مصنّف: احسن عزیز

صفحات: ۲۲۳ ۔ قیمت: ۴۰ روپے

پتا: سیّد نسیم احمد، ۷ اے۔ بی۔ بلاک ۱۳۔ ڈی، گلشنِ اقبال۔ کراچی

"اِک رشتۂ غم" احسن عزیز کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ ان کا دوسرا شعری مجموعہ جلد ہی منظرِ عام پہ آیا ہی چاہتا ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ سے برسوں پہلے احسن عزیز کا شمار ڈھاکہ یونیورسٹی کے ذہین طلبہ میں ہوتا تھا۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے وہ غزلیں کہنے لگے تھے۔ تب سے اب تک غزل ہی ان کے وارداتِ قلبی کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ احسن عزیز سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے چاٹگام میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ اس کے بعد وہ سوئن برن انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی ملبورن (آسٹریلیا) میں بہ حیثیت استاد مقرر ہوئے۔ اور تاحال اسی سے منسلک ہیں۔

احسن عزیز اچھی غزلیں کہنے کے باوجود پاکستان و ہندوستان کے ادبی حلقوں سے بہت زیادہ متعارف نہ ہو سکے۔ اس کے بظاہر دو وجوہ ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ پاک و ہند کے ادبی منظر سے اتنی دُور ہو گئے کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والا معاملہ ہو گیا۔ اگر وہ انگلینڈ، امریکا یا کناڈا میں ہوتے تو پھر بھی اُردو حلقوں سے اتنی دُوری نہ ہوتی۔ آسٹریلیا، اردو کے معاملے میں مذکورہ بیرونی ممالک سے بہت پیچھے ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ بذاتِ خود مزاجاً متحمل ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ شہرت کے مروجہ ہتھکنڈے سے ناواقف اور کنج بہ نشیں کے طرفدار ہیں۔

ڈھاکہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد احسن عزیز نے لندن میں انگریزی کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں۔ اس ناتے انھیں قدیم و جدید انگریزی ادب کو کھنگالنے کا خوب موقع ملا۔ ظاہر ہے دورانِ تعلیم و مطالعہ ان کے ذہن میں اُردو اور انگریزی ادب کی ایک تقابلی سطح بھی ظاہر ہوئی ہو گی۔ ان کی غزلوں میں ذکرِ عشق و دنیا کے ساتھ فکری عناصر کا ورود اسی تعلق سے ہوا ہے۔ غزل میں ذکرِ عشق و دنیا جب فکری حوالے سے وارد ہو تو اس کا رنگ جداگانہ نظر آتا ہے۔ احسن عزیز کی غزلوں کو پڑھتے ہوئے مجھے بار بار اِس رُخ کا احساس ہوا ہے۔ اور انھیں معنوں میں قبیلۂ غزل گویاں میں رہ کر بھی وہ اس میں گم نہیں ہوئے۔

ہم اُس سے جُدا ہو کے جُدا ہو نہیں پائے — ہر چیز میں وہ قرب حلاوت کی طرح تھا
ہر فاصلۂ درد کے ہوتے وہ سراپا — خوشبو میں پریشاں کسی چاہت کی طرح تھا

"اِک رشتۂ غم" کے لیے دیباچہ بزرگ و معتبر شاعر جناب افسر ماہ پوری نے لکھا ہے۔ احسن عزیز کے فن و شخصیت کے بارے میں یہ ایک وقیع اور کارآمد مقالہ ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے میرا مزید کچھ لکھنا تکرار کے مترادف ہو گا۔

شعری مجموعہ بہت اچھا چھپا ہے اور مطالعے کی دعوت دیتا ہے۔

—— ا۔س

سفرنامۂ اقبال

مصنف و مولف: **محمد حمزہ فاروقی**

صفحات: ۲۸۲ — **قیمت:** ۸۵

پتا: مکتبہ اسلوب پوسٹ بکس ۲۱۱۹ — کراچی ۱۸

محمد حمزہ فاروقی صاحب سیر و سفر کے آدمی ہیں، نظر بلیغ اور مشاہدے میں عمق رکھتے ہیں، اس لیے ان کے قلم سے نکلے ہوئے سفرنامے حقیقت پر مبنی ہوتے اور رطب و یابس سے کترا کے نکل جاتے ہیں۔ ان میں سفر کی عمومی دلچسپی کے ساتھ ساتھ سوچنے والے ذہنوں کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر ان کے سفرنامے بصارت اور بصیرت دونوں کی سیری کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔

جناب محمد حمزہ فاروقی کی تازہ کتاب اگرچہ "سفرنامۂ اقبال" ہے لیکن مجھے اسے "سفرنامۂ محمد حمزہ فاروقی" بھی کہنے کو جی چاہتا ہے۔ انھوں نے جس سلیقے سے علامہ سے متعلق اخبارات و رسائل میں بکھری ہوئی معلومات، دوسری گول میز کانفرنس منعقدہ لندن اکتوبر ۱۹۳۱ء میں علامہ کی مصروفیات، اطالیہ کی دعوت پر ان کی وہاں تشریف آوری اور قاہرہ میں مصری اہلِ قلم سے ملاقاتیں ایک دھاگے میں پرو دی ہیں۔ وہ بذاتِ خود ایک کارنامہ ہے۔ یہ کام اپنے موضوع سے گہری وابستگی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اور یہ وابستگی جناب محمد حمزہ فاروقی کی علامہ اقبال سے انتہائی عقیدت و محبت کی عطا کردہ ہے۔

"سفرنامۂ اقبال"، پہلی مرتبہ ۱۹۷۳ء میں اشاعت پذیر ہوا تھا اور اب تقریباً ۵ برس بعد دوبارہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا ہے۔ کتاب کا آغاز "فرمودات مہر" سے ہوتا ہے جو محمد حمزہ فاروقی کے نام مولانا غلام رسول مہر کے خطوط کے اقتباسات پر مشتمل ہے۔ مولانا نے اپنے خطوط میں نہ صرف حوصلہ افزائی کے کلمات لکھے بلکہ فروگزاشتوں کی طرف نشاندہی بھی کی اور علامہ کے حیات و فن کے کچھ نئے گوشوں کی طرف اشارے کیے ہیں۔ مولانا مہر، علامہ کے بہت سے معاملات کے عینی شاہد تھے۔ ان کی معیت میں دور دراز کا سفر کیا تھا اور ہم جلیسی کی سعادت بھی حاصل رہی تھی اس لیے ان کے مفید مشوروں کی بدولت بہت سے اوجھل اور نظرانداز شدہ ابواب اس کتاب میں کھل گئے ہیں۔

کتاب مذکور کے لیے جناب بشیر ڈار نے مقدمہ لکھا ہے جو اس کے سیاق و سباق کے عین مطابق ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس مقدمے کی حیثیت کسی پیرہن کے گوٹے کی سی ہے جس کی موجودگی سے اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

یہ کتاب مکتبہ اسلوب کراچی نے شائع کی ہے۔ علامہ اقبال کے موضوع پر ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسلوبیاتِ میر

مصنف

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

قیمت: ۲۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی ۱

گرد و پیش

انجمن میں ہندوستانی شعرا

۲۸ مارچ ۸۹ء کو ہندوستان سے آئے ہوئے مہمان شعرا جناب جگن ناتھ آزاد، جناب مخمور سعیدی اور جناب قیس رامپوری انجمن میں تشریف لائے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی مشیر علمی و ادبی انجمن، نے مہمانوں کا حاضرین سے تعارف کرایا۔ کچھ دیر ادب کے حوالے سے مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ پھر انھوں نے معروف شاعر جناب مخمور سعیدی کو نثری نظم کے موضوع پر اظہارِ خیال کی دعوت دی۔ مخمور سعیدی صاحب نے کہا کہ پندرہ بیس سال اُدھر ہمارے یہاں نثری نظم بہت قوت اور زور کے ساتھ میدانِ ادب میں وارد ہوئی۔ معروف شاعر جناب شہریار نے اپنے مجموعے "ساتواں در" میں ایک حصّہ نثری نظم کا بھی شائع کیا تھا۔ اس طرح کی ایک کتاب نوجوان نسل کے جناب علی حیدر آبادی کی بھی آئی۔ لیکن یہ زور دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اردو ادب سے اس کا دیس نکالا ہوگیا ہے۔ پھر ڈاکٹر اسلم فرخی نے جگن ناتھ آزاد صاحب سے اس بارے میں کچھ اظہارِ خیال کرنے کی درخواست کی۔ جناب جگن ناتھ آزاد نے کہا: "اگرچہ نثری نظم ہمارا مزاج نہیں لیکن ہم اس کے امکانات کے منکر بھی نہیں۔ جب کوئی نیا تجربہ روشناس ہوتا ہے تو اسے اس طرح کی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔" جناب جگن ناتھ آزاد نے اس کے جواز میں نظم آزاد و معرّیٰ کے حوالے دیتے ہوئے کہا کہ "جب یہ نظمیں نئی نئی متعارف ہوئی تھیں تو بزرگوں کی طرف سے ایڑی چوٹی کی مخالفت کی گئی تھی لیکن آج وہی مقبول ترین فارم شمار ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں یہاں میں ایک بات کہتا چلوں کہ تا حال نظم آزاد و معرّیٰ میں میراجی اور ن۔م راشد ہی نقطۂ آغاز و انجام ہیں۔"

جناب مظفر علی سید نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ یہ ٹھیک ہے، نثری نظم کا وہ زور باقی نہیں ہے لیکن اس عرصے میں نثری نظم نے ایک بڑا نام سارہ شگفتہ کا دیا ہے۔ جناب مظفر علی سید نے جناب جگن ناتھ آزاد سے ان کے فراق گورکھپوری پر لکھے ہوئے مضمون کے حوالے سے دریافت کیا کہ وہ کن معنوں میں فراق کو بڑا شاعر نہیں سمجھتے۔ اس پر جگن ناتھ آزاد نے کہا کہ ہمارے یہاں بڑے اور اچھے کے فرق کو مدِ نظر نہیں رکھا جاتا۔ کولرج بڑا شاعر کی توضیح میں یہ کہتا ہے کہ بڑے شاعر کے یہاں GREAT THOUGHT CONTENTS ہونا چاہیے۔ فراقؔ، فیضؔ، جوشؔ، یہ سب بلاشبہ اچھے شاعر ہیں۔ بڑے شاعر کا تصوّر غالبؔ اور اقبال میں ابھرتا ہے۔ بات آگے بڑھ کر جب تنقید تک پہنچی تو جناب علی حیدر ملک نے ابتدائی تنقیدی نقوش کے ضمن میں مولانا حالیؔ اور نواب امداد امام اثرؔ کا ذکر کیا۔ ادب کے مختلف اصناف کے حوالے سے بڑے اچھے نکات سامنے آئے۔ جناب مظفّر علی سیّد نے کئی بہت اچھے سوالات اٹھا کر گفتگو کو پھیلنے بڑھنے کا موقع فراہم کیا۔ اس منزل میں جناب منظر تپش، جناب سبھی فاروقی، جناب افتخار اجمل شاہین اور جناب توقیر چغتائی شامل ہو گئے۔

پھر مہمان شعرا سے کلام سنانے کی درخواست کی گئی۔ جگن ناتھ آزاد، محمود سعیدی اور قیس رامپوری نے اپنا کلام پیش کیا۔ بعد ازاں مشیر علمی و ادبی نے مہمانوں کی آمد کا شکریہ ادا کیا۔

آؤ صحت کی فکر کریں

عالمی یومِ صحت ہر سال اپریل کے مہینے میں منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر ہمدرد فاؤنڈیشن کی جانب سے ایک آٹھ ورقہ کتابچہ "آؤ صحت کی فکر کریں" شائع کیا گیا ہے۔ اس میں ڈائرکٹر جنرل عالمی ادارۂ صحت کا پیغام ہے۔ اس کے علاوہ بچّوں، نوجوانوں، مَردوں، خواتین اور عمر رسیدہ کے لیے صحت کو برقرار رکھنے کے کچھ اشارات دیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمدرد فاؤنڈیشن پشاور، لاہور، پنڈی اور کراچی میں "نونہال صحت کانفرنس" کا اہتمام کر رہا ہے جو پاکستان میں اپنی نوعیت کا منفرد پہلا قدم ہوگا۔

رام لعل کو اردو شرومنی ساہتیہ کار ایوارڈ

پنجاب کے بھاشا وبھاگ کی جانب سے اس سال کا "شرومنی ساہتیہ کار ایوارڈ (اردو) معروف افسانہ نگار جناب رام لعل کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ ہر سال ایک اردو ادیب کو اس کی مجموعی خدمات پر دیا جاتا ہے۔ یہ ایوارڈ اکیاون سو روپے کے کیش، شال، تمغے اور سپاس نامے پر مشتمل ہے۔

بھاشا وبھاگ پنجاب کی جانب سے اس اعزاز کے علاوہ اردو زبان و ادب کی متعدد اسکیموں پر کام کیا جا رہا ہے۔

ادارۂ یادگارِ غالب میں مہمانوں کی آمد

گزشتہ دنوں ادارۂ یادگارِ غالب میں ہندوستان، بنگلہ دیش اور عرب امارات سے آئے ہوئے مہمان جناب انصار اللہ نظر، جناب عطاء الرحمٰن جمیل اور جناب ع۔ س مسلم کے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کیا گیا۔

ادارۂ یادگارِ غالب کے جنرل سکریٹری جناب مختار زمن نے حاضرین سے مہمانوں کا تعارف کرایا اور بعد ازاں ع۔ س مسلم نے اپنی طویل تحتیہ نظم کے چند بند سنائے۔ پھر عطاء الرحمٰن جمیل نے ایک مختصر نظم کاکس بازار سنائی جس کا تعلق گوتم بدھ سے تھا۔

آخر میں جناب انصار اللہ نظر نے ہندوستان میں ہونے والے بہت بڑے ادبی کام "دی انٹگریٹڈ ہسٹری آف انڈین لٹریچر" کے بارے میں بتایا جس کے اردو حصّے کے لیے جناب موصوف کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ اس تاریخی کام کی نوعیت پر مختلف گوشوں سے سوالات آئے۔ جناب انصار اللہ نظر نے بڑی صراحت کے ساتھ جواب دیا۔ بات اردو ادب کے جانے پہچانے محقق سے ہو رہی تھی اس لیے حاضرین کے سامنے تحقیق کے نئے گوشے بھی آئے۔

اس نشست میں مقامی ادیبوں اور دانشوروں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

ہائیکو کا عالمی مقابلہ

عظیم جاپانی شاعر مٹسو باشو (۱۶۴۴ - ۱۶۹۴) ۱۶۸۹ء میں ایک سو پچاس دن کے سفر پر نکلے۔ اور شمالی جاپان کے

دو ہزار چار سو کیلو میٹر خطۂ زمین کو چھان مارا۔ انھوں نے اس کے تاثرات کو ایک جرنل "اوکونو ہوسو موحی" (انتہائی شمال کے تنگ راستے) میں یکجا کر دیا۔ اظہارِ خیال کے لیے جو فارم اختیار کیا وہ "ہائیکو" تھا جس کے لیے آج باشو بہ طور خاص مشہور ہیں۔

اسی جرنل کے تین سو سالہ جشن کے موقع پر جاپان کی جانب سے ایک "ہائیکو" مقابلے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ مقابلے کے شرائط یہ ہیں۔ ہر نظم تین مصرعوں کی ہونی چاہیے۔ ارکان کی کوئی قید نہیں۔ نظمیں فطرت یا انسانی زندگی کے کسی خاص رُخ کو بیان کرتی ہوں۔ لیکن ہائیکو کی روایت کے مطابق نظم میں کسی نہ کسی موسم کی رعایت ضرور ہونی چاہیے۔ دو سے زیادہ نظمیں ارسال نہ کی جائیں۔ مرسلہ نظموں کا غیر مطبوعہ ہونا ضروری ہے۔

مقابلے میں پانچ زبانوں یعنی انگریزی، فرنچ، جرمن یا اطالین کے توسط سے داخلے کی اجازت ہے۔ داخلے کی آخری تاریخ ۳۰ر اپریل ۱۹۸۹ء ہے۔ نظمیں مندرجہ ذیل پتے پر ارسال کی جائیں۔

WORLD HAIKU CONTEST

NHK SENDAI - STATION

1-11-1- NISHIKI - CHO

SENDAI - SHI, JAPAN

اختر الایمان کے فن و شخصیت پر دلّی میں سمینار

۷ر فروری ۱۹۸۹ء کو شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام اور اردو اکادمی دہلی کے تعاون سے ممتاز شاعر اختر الایمان کی شخصیت اور شاعری پر ایک سمینار منعقد کیا گیا۔ پروفیسر قمر رئیس نے سمینار کی غرض و غایت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اختر الایمان جیسے معتبر و منفرد اور ممتاز شاعر کو اب تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ ہمارے یہاں عموماً بعد از مرگ ادیب کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا رواج ہے۔ اگر زندگی ہی میں اس کی خدمات کا اعتراف کر لیا جائے تو اس سے دونوں کو فیض پہنچے گا۔ ادیب کو بھی اور اس کے پرستاروں کو بھی۔

سمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر شمیم حنفی نے فرمائی، افتتاحی تقریر پروفیسر محمد حسن نے کی۔ اور مہمانِ خصوصی امریکہ سے آئے ہوئے شاعر جناب اعجاز احمد کو بنایا گیا۔ جن حضرات نے مقالے پڑھے ان کے نام نامی اور ان کی تخلیقات کی تفصیلات یہ ہیں۔

(۱) "اختر الایمان چند تاثرات" جناب رفعت سروش

(۲) "اختر الایمان کی شاعری کے سروکار" ڈاکٹر صادق

(۳) "اختر الایمان کا علامتی اور طنزیہ اسلوب" ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی

(۴) "اختر الایمان کی شاعری کے مضمرات" ڈاکٹر عتیق اللہ

(۵) "اختر الایمان کا تصورِ نظم" پروفیسر محمد حسن

ان مقالات کے پڑھے جانے کے بعد بحث و سوالات کا آغاز ڈاکٹر عتیق اللہ نے کیا، جناب کمال احمد صدیقی، جناب رشید حسن خاں اور جناب شہاب جعفری نے اس کو آگے بڑھایا۔ مہمانِ خصوصی جناب اعجاز احمد نے کہا کہ اختر الایمان نے شاعری کو نئی راہوں سے روشناس کرایا ہے۔ صدرِ جلسہ جناب شمیم حنفی نے اپنے صدارتی کلمات میں اختر الایمان کی شاعری کا تفصیل سے جائزہ لیا۔

سیمینار کے دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن نے کی۔ اس اجلاس میں مہمان خصوصی کے طور پر ماسکو سے آئے ہوئے ادیب جناب سرگئی سخاچوف شریک ہوئے۔ دوسرے اجلاس میں پڑھے گئے مقالات اور مقالہ نگاروں کے نام نامی۔

(۱) "اختر الایمان اور ماضی کی بازیافت" ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی

(۲) " " " " " ڈاکٹر قمر رئیس

(۳) "اختر الایمان کے حوالے سے جمالیات کا اظہار" پروفیسر ش۔ اختر

(۴) "اختر الایمان کی شاعری میں علامت نگاری" ڈاکٹر شریف احمد

ان مقالات کے بعد مہمان خصوصی جناب سرگئی سخاچوف نے اختر الایمان سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن کے صدارتی کلمات کے بعد پروفیسر قمر رئیس نے تمام مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی نئی مطبوعات

ادب اور ثقافت کے موضوع پر معروف دانشور محقق و نقاد کراچی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشیں ڈاکٹر جمیل جالبی کی تین کتابیں "اسلامی کلچر"۔ "اسلامی جدیدیت" اور "میراجی ــ ایک مطالعہ" تکمیل کے آخری مراحل میں ہیں اور عنقریب شائع ہو جائیں گی۔ واضح رہے کہ کلیاتِ میراجی کے نام سے ڈاکٹر صاحب کی مرتب کردہ ایک ضخیم کتاب چند ماہ پہلے چھپ چکی ہے اور اب اس دوسری کتاب کی اشاعت کے بعد میراجی کی شخصیت اور فن کا مکمل احاطہ ہو جائے گا۔

اردو میں تار کی ترسیل کا انتظام کیا جائے

سندھی ادبی بورڈ کے چیئرمین مخدوم محمد زماں طالب المولیٰ نے کہا کہ عوام کی بے لوث خدمت کرنا ہر محکمے کا اوّلین فرض ہے۔ وہ پوسٹ آفس ہالہ کی نئی عمارت کی افتتاحی تقریب سے خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ برصغیر میں ڈاک کا نظام روشناس کرانے میں سندھ کو خصوصی اعزاز حاصل ہے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ ہالہ کو ٹائٹ پوسٹ آفس ٹیلیکس اور دیگر جدید سہولتوں کی فراہمی کے علاوہ یہاں اردو میں تار کی ترسیل کا خصوصی انتظام کیا جائے۔ قبل ازیں پوسٹ ماسٹر جنرل ڈاکٹر صلاح الدین احمد نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ افتتاحی تقریب میں علامہ غلام مصطفیٰ شاہ قاسمی، مخدوم سعید الزماں اور محمد حاجن کے علاوہ معززینِ شہر اور اعلیٰ حکام نے شرکت کی۔ (روزنامہ جنگ، کراچی)

سرکاری زبان اردو کرنے کے لیے ٹھوس انتظامات کیے گئے ہیں

کابینہ ڈویژن کے انچارج وزیر خواجہ طارق رحیم نے ایک تحریری جواب میں ایوان کو بتایا کہ حکومت نے آئین کے مطابق سرکاری زبان کو انگریزی سے اردو میں بدلنے کے عمل کے لیے ٹھوس انتظامات کیے ہیں۔ وہ حاجی فضل رازق کے ایک تحریری سوال کا جواب دے رہے تھے۔ (روزنامہ مرکز، اسلام آباد)

اردو کی اہمیت سے متعلق بانیٔ پاکستان کے ارشادات پر مبنی اسٹکر آویزاں کیے جائیں

معروف سماجی کارکن اور ضلعی زکوٰۃ وعشر کمیٹی کے سابق چیئرمین حکیم سلطان احمد داؤدی کی زیرِ صدارت گزشتہ روز ضلعی مجلسِ زبانِ دفتری کا اجلاس منعقد ہوا جس میں اردو زبان کے فروغ کے سلسلے میں مختلف امور پر غور کیا گیا۔ حکیم سلطان احمد داؤدی نے کہا ہے کہ سرکاری افسروں کو چاہیے کہ وہ انگریزی زبان کی بجائے اپنا مافی الضمیر اردو زبان میں بیان کرنے کی کوشش کریں۔ کیوں کہ اپنی زبان میں اپنے عوام کو بہتر انداز میں قومی امور کے بارے میں سمجھایا جا سکتا ہے۔ افسر اطلاعات رانا بشیر احمد نے اجلاس میں تجویز پیش کی کہ تمام دفاتر میں بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے ان ارشادات پر مبنی "اسٹکرز" آویزاں کیے جائیں جو کہ اردو زبان کی افادیت اور اہمیت کے بارے میں ہوں۔ (روزنامہ عوام فیصل آباد)

اظہارِ تعزیت

جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کی اس اندوہناک اطلاع پر کہ صوبہ سرحد کے ایوب صابر اللہ کو پیارے ہو گئے، انجمن ترقی اردو سرگودھا کا ایک تعزیتی اجلاس حضرت اخگر سرحدی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں ایوب صابر کے مرگِ مفاجات پر دلی رنج وغم کا اظہار کیا گیا۔ اس موقع پر ایک تعزیتی قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ ایوب صابر کی مرگِ ناگہانی اردو زبان اور پشتو زبان کے لیے ایک سانحۂ عظیم ہے۔ یہ اجلاس خدائے بزرگ وبرتر سے دعا کرتا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے۔ اور ان کے لواحقین پر صبرِ جمیل کی توفیق ارزانی کرے۔

یہ اجلاس حکومتِ سرحد، مقتدرہ قومی زبان، اکادمی ادبیاتِ پاکستان اور اباسین آرٹ کونسل صوبہ سرحد کے اربابِ اختیار کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کراتا ہے کہ ایوب صابر کے گھریلو حالات نامساعد ہیں لہٰذا ان کے گھر والوں کے لیے ایک خاص رقم یا ماہانہ وظیفہ مقرر کر کے صوبہ سرحد کے ادبی حلقوں کو ممنون کریں۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

عظیم مشہود شاہد
ناظم انجمن ترقی اردو، سرگودھا

ممتاز شاعر نیاز حیدر کی رحلت

گزشتہ دنوں ممتاز شاعر نیاز حیدر انتقال کر گئے۔ مرحوم ترقی پسند تحریک کے معماروں میں تھے انھوں نے شہرت اور منصب وجاہ سے بے نیاز ہو کر ترقی پسند تحریک اور اردو زبان وادب کی خدمت انجام دی، انھوں نے کالی داس اور چرن جیت کے ناٹکوں کو تخلیقی انداز سے اردو کا جامہ پہنایا اور امیر خسرو اور مرزا غالب کے بارے میں طبع زاد ڈرامے تحریر کیے۔ نیاز حیدر "اپٹا" اور ہندوستانی تھیٹر گروپ سے بھی وابستہ رہ کر اپنے کئی ڈرامے اسٹیج کیے۔ انھوں نے بے نیازانہ زندگی بسر کی اور انسان دوستی کی اعلا قدروں کی ترویج کے لیے آخری سانس تک کام کیا۔

حرفِ تازہ

کتابیں

وجودیت، کرداریت اور اسلام ——— مصنف: نوید شبلی
تفسیات
صفحات: ۱۳۸۔ قیمت: ۸۵ روپے
پتا: ندیم شبلی/نشید شبلی، پبلی کیشنز، ۹۹۳ بی۔ غلام محمد آباد، فیصل آباد

عورت جرائم کی دلدل میں ——— مصنف: انعام الرحمٰن سحر
مضامین
صفحات: ۳۱۷۔ قیمت: ۹۹ روپے
پتا: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

اسلامی بحری بیڑہ منزل بہ منزل ——— مصنف: سید عبدالصبور طارق
تاریخ
صفحات: ۱۷۰۔ قیمت: ۱۲۰ روپے
پتا: فیروز سنز، لاہور، پنڈی، کراچی

بچوں کا ادب ۔ ایک جائزہ ——— مصنف: میرزا ادیب
بچوں کے لیے
صفحات: ۱۴۴۔ قیمت: ۶۰ روپے
پتا: مقبول اکیڈمی۔ اردو بازار، لاہور

عین المعارف ——— مصنف: حضرت آسی غازی پوری
شاعری
صفحات: ۳۲۲۔ قیمت:
پتا: مکتبہ رضویہ۔ آرام باغ روڈ، کراچی

کتابِ دوستاں ——— مصنف: حکیم محمد سعید
اقوال
صفحات: ۱۳۶۔ قیمت: ۳۰ روپے
پتا: ہمدرد فاؤنڈیشن پریس۔ ہمدرد سنٹر، ناظم آباد، کراچی

خواب دریچے ——— مصنف: وضاحت نسیم
شاعری
صفحات: ۱۵۲۔ قیمت: ۴۵ روپے
پتا: افسر پبلی کیشنز ۱۸/۵۹۴ سمن آباد فیڈرل بی ایریا، کراچی

منتخب ہائیکو ——————— مرتّب: نسیم سحر
ہائیکو (شاعری)
صفحات: ۱۰۳ - قیمت: ۳۰ روپے
پتا: شاخسار پبلیشرز پوسٹ بکس نمبر ۱۰۶۰ راولپنڈی

سفرنامۂ اقبال ——————— مؤلف و مصنّف: محمد حمزہ فاروقی
سفرنامہ
صفحات: ۲۸۳ - قیمت: ۸۵ روپے
پتا: مکتبہ اسلوب، پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱۹، کراچی ۱۸

ذائقہ میرے لہو کا ——————— مصنّف: شمیم فاروقی
شاعری
صفحات: ۱۴۴ - قیمت: ۳۰ روپے
پتا: بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

تجلّیاتِ شمن ——————— مصنّف: قاضی شمس الحق
شاعری
صفحات: ۷۵ - قیمت: ۳۰ روپے
پتا: ضیاءِ ادب کبیر اسٹریٹ اردو بازار، لاہور

جریدے

دائرے (سالنامہ) ——————— مرتبین: حسنین کاظمی، ممتاز مرزا، مشرف احمد
صفحات: ۳۰۴ - قیمت: ۳۵ روپے
پتا: شاہین چیمبرز - ۴، کمرشل ایریا بلاک ۷، ۸ کے۔ سی۔ ایچ۔ ایس، کراچی

انتخاب (اشاعتِ خاص دسمبر ۱۹۸۸ء) ——————— مدیر: ذاکر عزیزی
صفحات: ۱۳۴ - قیمت: ۱۵ ٹاکا
پتا: مرکزِ تخلیقِ ادب، ڈاکٹر ذکرالحق روڈ۔ سیدپور (نلفاماری) بنگلہ دیش

اثبات (سہ ماہی) ——————— مدیرہ: بیگم نسیم اختر
صفحات: ۶۴ - قیمت: ۵ روپے
پتا: ۱۹۱ - اے ستلج بلاک علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

افکار (ماہنامہ) ——————— مدیر: صہبا لکھنوی
صفحات: ۸۶ - قیمت: ۸ روپے
پتا: مکتبۂ افکار رابسن روڈ۔ کراچی

جولائی تا دسمبر ۱۹۸۸ء کا موضوع وار اشاریہ

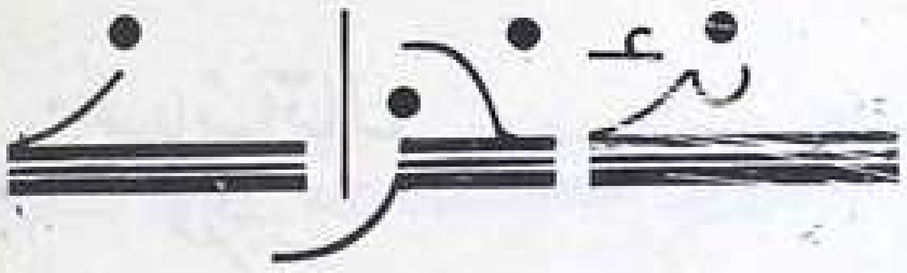

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

کتابیات

ابو سلمان شاہجہان پوری، ڈاکٹر	نئے خزانے	قومی زبان، کراچی	نومبر	۱۹۸۸ء ص ۹۲
〃	〃	〃 〃	دسمبر	〃 ص ۸۷
جمیل احمد رضوی، سیّد	اشاریہ سازی	تحقیق، حیدرآباد		۱۹۸۷ء نمبر ۱ ص ۳۳
خالد محمود خضر، حافظ	اشاریہ حکمت قرآن بابت سال ۱۹۸۸ء	حکمت قرآن، لاہور	دسمبر	۱۹۸۸ء ص ۵۹
رالجہ اقبال	رسالہ عصمت کا پاکستانی دور	تحقیق، حیدرآباد		۱۹۸۷ء نمبر ۱ ص ۹۳
—	اشاریہ الاعتصام۔ جنوری تا دسمبر ۱۹۸۸ء جلد ۴۰	الاعتصام، لاہور ۱۶ دسمبر		۱۹۸۸ء ص ۱

نوادر علمیہ

ابن حسن برنی	ایک تحریر	قومی زبان، کراچی	نومبر	۱۹۸۸ء ص ۱۳
اسلم قرشی، ڈاکٹر	نوادر کتب خانۂ خاص: الف لیلہ نو منظوم	〃 〃	جولائی	〃 ص ۷
	رسالہ اصول کلوں کے باب میں	〃 〃	ستمبر	〃 ص ۴۷
اطہر مبارک پوری، قاضی	عہد نبوی کی چند یادگار تحریریں	الحق، اکوڑہ خٹک	دسمبر	〃 ص ۱۵
محمد اسمٰعیل، سیّد شاہ	ایک نادر جنتری	خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ	۴۶	〃 ص ۳۳۴
معین الرحمٰن، ڈاکٹر سیّد	پطرس بخاری کی دو کمیاب نگارشات	قومی زبان، کراچی	دسمبر	〃 ص ۲۵

تاریخ و سیاست

ابو النظر رضوی، سید	معاشی انقلاب کی رہنمائی	صوت الاسلام، فیصل آباد	جون	۱۹۸۸ء ص ۹
ابو عبد الرحمٰن	آبِ زم زم	الہام، بہاولپور ۲۸ ستمبر		〃 ص ۵
اخلاق حسین قاسمی، مولانا	پاکستان میں جذباتی سیاست کا مستقبل	ندا، لاہور ۲۵ اکتوبر		〃 ص ۳۵

ارشاد احمد خاں عباسی	جوئیہ خاندان	التبیر، بہاولپور	جون	ص ۸۹
اسرار احمد، ڈاکٹر	جماعت اسلامی اور پاکستان کی سیاست	ندا، لاہور	۶ر ستمبر	ص ۱۰
اسرار احمد، ڈاکٹر	جمہوریت، سوشلزم اور اسلام	〃 〃	۲۵ر اکتوبر	ص ۳۱
ثروت جمال	دینی سیاسی جماعتوں کا مستقبل	تکبیر، کراچی	۸ر دسمبر	ص ۹
〃	〃 〃 (۲)	〃 〃	۲۹ر 〃	ص ۱۵
جلال الدین قادری، محمد	پاکستان اور سنّی علما و مشائخ	الہام، بہاولپور	۱۴ر اگست	ص ۷
جمیل جالبی، ڈاکٹر	پاکستانی معاشرہ	قومی زبان، کراچی	ستمبر	ص ۱۳
خالد، سیف اللہ	برما کے مسلمان اور عالمِ اسلام	ابلاغ، 〃	〃	ص ۴۸
رسول جعفریان، حیات	انقلابِ کربلا — ایک تاریخی جائزہ	توحید، ایمان	ستمبر و اکتوبر ۱۹۸۸ء	ص ۱۲۷
رفیق افغان	صدر ضیا الحق اور جہادِ افغان	تکبیر، کراچی	یکم ستمبر	ص ۳۷
شبیر ابن عادل	صدر ضیا الحق کے گیارہ سال	〃 〃	〃	ص ۴۳
شبیر احمد عثمانی، مولانا	پاکستان کا نظریہ اور اسلامی نظام	صوت الاسلام، فیصل آباد	اگست	ص ۵
شبیر طاہر	جنگِ بدر	خدام الدین، لاہور	۲۳ر ستمبر	ص ۲۰
صباح الدین عبدالرحمٰن، سیّد	اسلامی ریاست کا تصوّر	فکر و نظر، اسلام آباد	جنوری تا مارچ	ص ۱۸۵
صلاح الدین، محمد	کیا جمہوریت محض سیاست دانوں کی حکومت کا نام ہے؟	تکبیر، کراچی	۸ر ستمبر	ص ۹
ضیاالدین لاہوری	سرسیّد اور دو قومی نظریہ	الحق، اکوڑہ خٹک	جولائی	ص ۳۵
طارق مجید	سانحۂ بہاولپور	ندا، لاہور	۴ر اکتوبر	ص ۲۶
ظفر الحق، قاضی	تحریکِ نور بدیع الزمان سعید نورسی	میثاق، 〃	اگست	ص ۵۵
〃	〃 〃	〃 〃	ستمبر	ص ۷۹
عابد عبدالکریم	آذربائیجان — روس کا حصّہ کیسے بنا	ندا، 〃	۲۷ر ستمبر	ص ۳۹
عابد عبدالکریم	صدر ضیا کے بعد کیا ہوگا؟ کیا ہونا چاہیے۔	〃 〃	۳۰ر اگست	ص ۱۰
عدنان، اختر نعیمہ	پاکستان کی موجودہ صورتِ حال میں اسلامی انقلاب کی ضرورت	میثاق، لاہور	اکتوبر ۱۹۸۸ء	ص ۵۷
عزیزی، زبیدی	فلسطینی ریاست کا قیام	اہلِ حدیث 〃	۹ر دسمبر	ص ۴
عزیز ناردی	پاکستان میں انتخابات کی تاریخ	اخبارِ جہاں، کراچی	۳۱ر اکتوبر	ص ۸
عمر خطاب، قاری	غزوۂ بدر کی اہمیت	انجمن، 〃	نومبر	ص ۳۴
عمر مختار	سنکیانگ کے مسلمان	ندا، لاہور	۱۳ر ستمبر	ص ۲۶

نہال فتح پوری، ڈاکٹر	مسلم قومیت، تحریکِ پاکستان اور اردو	نگار،	کراچی	اگست	ص ۶
فیض احمد اویسی	دو قومی نظریہ اور علمائے اہلِ سنت	الہام،	بہاولپور	۲۱ر اگست	ص ۶
محمد اسلم خاں	آزاد فلسطین کے اعلان کا منظر پس منظر	ندا،	لاہور	۲۰ر دسمبر	ص ۴۲
محمد خالد قادری	بیت المقدس کے لیے عالمِ اسلام میں خون کے آنسو	صوت الاسلام،	فیصل آباد	جون ۱۹۸۸ء	ص ۲۵
محمد سعید حکیم	پاکستان ــ نظامِ سیاست	ہمدرد،	کراچی	اگست	ص ۴
محمد سعید، حکیم	صدارتی اور شورائی نظام بہتر ہے	ندا،	لاہور	۱۳ر ستمبر	ص ۲۴

افغانستان

ناصر محمود	سو بار سُنا ایک بار دیکھا (۴)	تکبیر،	کراچی	۴ر اگست	۱۹۸۸ء ص ۲۱
	〃 〃 (۵)	〃	〃	۱۱ر 〃	〃 ص ۳۹
	〃 〃 (آخری قسط)	〃	〃	۲۲ر ستمبر	〃 ص ۴۵
نعیم عارفی، محمد	موت کے دن موت کی رات (آخری قسط)	〃	〃	۲۹ر ستمبر	〃 ص ۳۶

جنگِ آزادی

اکرم الدین قدوائی، ڈاکٹر	۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی	صوت الاسلام،	فیصل آباد	اگست	۱۹۸۸ء ص ۱۱
خادم حسین ٹبالوی	مولپوں کی جنگِ آزادی	〃	〃	〃	〃 ص ۱۹
سلیم اختر، ڈاکٹر محمد	۱۸۵۷ء کی جدوجہدِ آزادی میں موجودہ پاکستان کا کردار	اردو،	کراچی	جنوری	۱۹۸۸ء ص ۱۳۳
شمس الحق، علامہ	تحریکِ آزادی اور تحریکِ قیامِ پاکستان میں دینی مدارس کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔	صوت الاسلام،	فیصل آباد	اگست	۱۹۸۸ء ص ۱۷
طفیل ایمہ	تحریکِ آزادی میں علماء کا کردار	〃	〃	〃	〃 ص ۲۷
عبدالرشید عراقی	تحریکِ جہاد اور تاریخ سازی	محدث،	لاہور	نومبر	〃 ص ۵۰
محمد ابراہیم، میاں	ضلع گورداس پور اور تقسیم ملک ــ ریڈکلف ایوارڈ کا پس منظر	لاہور،	لاہور	۱۰ر ستمبر	۱۹۸۸ء ص ۵
محمد مسعود کھدر پوش	سندھ طاس کا معاہدہ	صوت الاسلام،	فیصل آباد	جون	〃 ص ۱۷
نصرت حسین ابڑو	تحریکِ آزادی میں سندھی عوام کی خدمات	〃	〃	اگست	〃 ص ۹

سیاست اور خواتین

ابوالبرکات احمد، مولانا	عورت کی سربراہی	الاسلام،	لاہور	۹ر دسمبر	۱۹۸۸ء ص ۹
اسرار احمد، ڈاکٹر	اسلام میں عورت کا مقام	تکبیر،	کراچی	۲۹ر دسمبر	〃 ص ۴۷
اسرار احمد سہاوری	عورت کی حکمرانی	ندا،	لاہور	۲۷ر دسمبر	〃 ص ۲۵
جانباز، مولانا محمد علی	عورت کے سیاست میں حصہ لینے کی شرعی حیثیت	الاعتصام،	〃	۲۳ر ستمبر	〃 ص ۱۶
〃	〃 (۲) 〃	〃	〃	۳۰ر 〃	〃 ص ۱۴
〃	〃 (آخری قسط) 〃	〃	〃	۷ر اکتوبر	〃 ص ۱۱
صلاح الدین، محمد	عورت کی سربراہی قرآن وسنت کی روشنی میں	تکبیر،	کراچی	۱۵ر دسمبر	〃 ص ۹
فضل الرحمٰن بن محمد، مولانا	اسلام میں عورت کی سربراہی کا کوئی تصور نہیں	الاعتصام،	لاہور	۲ر 〃	〃 ص ۱۸
محمد ازہر	عورت کی سربراہی کا مسئلہ	الخیر،	ملتان	〃	〃 ص ۹
محمد اسحاق، ڈاکٹر رانا	عورت کی قیادت ـ کتاب وسنت کی روشنی میں	اہلِ حدیث،	لاہور	۹ر 〃	〃 ص ۱۳
محمد اسلم، پروفیسر	عورت کی حکمرانی	ندا،	〃	۱۳ر 〃	〃 ص ۳۵
محمد اسلم رانا	عورت کی قیادت اور مذاہبِ سابقہ	الاعتصام،	〃	۹ر 〃	〃 ص ۱۴

شریعت ایکٹ اور مسئلہ نفاذ

اسرار احمد، ڈاکٹر	نفاذِ شریعت آرڈیننس ـ ایک ہمہ پہلو جائزہ	میثاق،	لاہور	جولائی	۱۹۸۸ء ص ۹
ثروت جمال اصمعی	شریعت آرڈیننس: دوسرا رخ				
	پروفیسر خورشید احمد سے گفتگو (۲)	تکبیر،	کراچی	۴ر اگست	۱۹۸۸ء ص ۱۳
ثروت جمال اصمعی	شریعت آرڈیننس: دوسرا رخ				
	پروفیسر خورشید احمد سے گفتگو (۳)	تکبیر،	کراچی	۲۵ر اگست	۱۹۸۸ء ص ۹
ریحان، عبدالغفار	آرڈیننس برائے نفاذِ شریعت اور ہمارا موقف	الاسلام،	لاہور	۱۵ر جولائی	〃 ص ۵
محمد زمان خان	شریعت آرڈیننس نے شریعت سے انحراف کی				
	راہ ہموار کر دی (پروفیسر خورشید احمد سے انٹرویو)	اخبارِ جہاں،	کراچی	۱۸ر جولائی	۱۹۸۸ء ص ۸
مقبول احمد قریشی	نفاذِ شریعت آرڈیننس	چٹان،	لاہور	۲۵ر 〃	〃 ص ۴
———	نفاذِ شریعت آرڈیننس قرآن کریم				
	کے آئینہ میں!	طلوعِ اسلام،	لاہور	جولائی	۱۹۸۸ء ص ۲

	شریعت آرڈیننس ۱۹۸۸ء	اخبارِ جہاں، کراچی	۲۷ر جون	۱۹۸۸ء ص۹
	نفاذِ شریعت آرڈیننس ۱۹۸۸ء			
	شریعت محمدی کی روشنی میں	محدث، لاہور		۱۹۸۸ء ص ۲

کشمیر

عبدالصمد درّانی	آزاد کشمیر کا قیام — پس منظر	کشیر، راولپنڈی	۱۸ر اکتوبر	۱۹۸۸ء ص ۷
عبدالصمد درّانی، خواجہ	کشمیر کی کہانی (۴۹)	〃 〃	۲۱ر جون	〃 ص ۲
	〃 (۵۱)	〃 〃	۵ر جولائی	〃 ص ۲
	〃 (۵۳)	〃 〃	۱۹ر 〃	〃 ص ۲
	〃 (۵۴)	〃 〃	۲۶ر 〃	〃 ص ۲
	〃 (۵۶)	〃 〃	۱۴ر اگست	〃 ص ۲
	〃 (۵۸)	〃 〃	۳۰ر 〃	〃 ص ۲
	〃 (۶۲)	〃 〃	۲۷ر ستمبر	〃 ص ۲
	〃 (۶۵)	〃 〃	۱۸ر اکتوبر	〃 ص ۲
	〃 (۶۷)	〃 〃	۸ر نومبر	〃 ص ۲
	〃 (۶۹)	〃 〃	۲۴ر 〃	〃 ص ۲
	〃 (۷۰)	〃 〃	۲۹ر نومبر	〃 ص ۲
کلیم اختر	حکومت آزاد کشمیر کا یوم تاسیس	〃 〃	۱۸ر اکتوبر	〃 ص ۱۹
محمد امیر خان	جنگ آزادی کشمیر کا سیاسی پس منظر	انصاف، 〃	۵ر 〃	〃 ص ۴
محمد عاشق، سردار	مسئلہ کشمیر	〃 〃	۱۳ر جولائی	〃 ص ۴
غلام احمد	خواجہ آزاد کشمیر — جمہوریت کا سفر	کشیر، 〃	۱۸ر اکتوبر	〃 ص ۱۱
	آزاد کشمیر اور پاکستان — باہمی تعلقات کا پہلا معاہدہ	کشیر، راولپنڈی	۱۸ر اکتوبر	۱۹۸۸ء ص ۴
	آزاد جموں و کشمیر مسلم کانفرنس — سالانہ اجلاس (۱۹۳۲ء تا ۱۹۸۸ء)	کشیر، راولپنڈی	۱۸ر اکتوبر	۱۹۸۸ء ص ۸

مسائل و افکار

اخبارِ جہاں پینل	جنرل محمد ضیاء الحق کا خصوصی انٹرویو	اخبارِ جہاں، کراچی	۲۲ر اگست	۱۹۸۸ء ص ۵

عزیز ندوی	خان عبدالولی خاں سے خصوصی انٹرویو	اخبارِ جہاں، کراچی ۱۹ر ستمبر	۱۹۸۸ء ص ۸
فاروق اقدس/ طاہر خلیل	چیف الیکشن کمشنر جسٹس اے ایس نصرت سے ملاقات	" " ۲۷ر اکتوبر	" ص ۸
قربان انجم	جنرل اعظم سے قومی امور پر انٹرویو	تکبیر، کراچی ۱۱ر اگست	۱۹۸۸ء ص ۷
قربان انجم	مولانا عبدالستار نیازی سے انٹرویو	" " ۲۲ر ستمبر	" ص ۲۷
محمد زماں خاں	کیا قیامِ پاکستان کے مقاصد پورے ہو گئے؟ (مختلف شخصیات سے انٹرویوز)	اخبارِ جہاں، کراچی ۱۵ر اگست	۱۹۸۸ء ص ۸
یونس خلش	میر ظفر اللہ خاں جمالی سے انٹرویو	چٹان، لاہور ۲۸ر ستمبر	" ص ۹
ـــــ	ایم۔ اے۔ ایم صدّیق سے انٹرویو	قومی زبان، کراچی جولائی	" ص ۴۵

ممالک و مقامات

ابوالحسن علی ندوی، مولانا سیّد	مسجدِ قرطبہ	الحق، کراچی، نومبر	۱۹۸۸ء ص ۲۶
اقبال شاہین	بیت المقدس کا تاریخی جائزہ	خدام الدین، لاہور ۱۹ر اگست	" ص ۱۳
شہزاد، محمد یوسف	شاہی جامع مسجد چترال	الہام، بہاولپور ۷ر اگست	" ص ۶
ظفر فریدی	مزار حضرت بابا فرید کا بہشتی دروازہ ــ تاریخی حیثیت	الہام، بہاولپور ۲۸ اگست	۱۹۸۸ء ص ۲
کلیم محمد دین	لاہور میں شاہجہانی دور کی مساجد	حمایت اسلام، لاہور اکتوبر	" ص ۷
محمد بھائی پٹنی، الحاج	اسلامی ہند کا تاریخی شہر اورنگ آباد	تعمیرِ حیات، لکھنؤ ۲۵ر اکتوبر	" ص ۹
نذیر احمد، ڈاکٹر	حیدر آباد کا پرانا نام ــ بھاگ نگر ــ افسانہ یا حقیقت	خدابخش لائبریری جرنل، پٹنہ نمبر ۴۷	۱۹۸۸ء ص ۸۷
نسیم سحر	بابِ جدّہ	قومی زبان، کراچی اگست	" ص ۱۷

تعلیم

اسرار احمد، ڈاکٹر	طلبہ کے مسائل اور ان کا حل	میثاق، لاہور اکتوبر	۱۹۸۸ء ص ۳۹
ثناء الحق صدیقی، مولوی	ابتدائی تعلیم	العلم، کراچی جولائی تا دسمبر	" ص ۷۸
حفیظ الرحمٰن صدیقی، ڈاکٹر	ہماری تعلیم	" " " "	" ص ۱۰۰
جعفر حسین شاہ، پروفیسر سیّد	دینی مدارس کی دینی اصلاحات	شمس الاسلام، بھیرہ نومبر	" ص ۴

مصنف	عنوان	رسالہ	تاریخ	صفحہ
جعفر حسین شاہ، پروفیسر سید	دینی مدارس کے لیے تعلیمی اصلاحات	الاعتصام، لاہور	۱۶/ ستمبر ۱۹۸۸ء	ص ۱۰
〃	〃	〃 〃	۲۳/ 〃 〃	ص ۱۳
〃	〃	〃 〃	۳۰/ 〃 〃	ص ۱۲
کامران موسیٰ	نظام تعلیم کی تشکیل نو	اخبارِ جہاں کراچی	۲۹/ اگست 〃	ص ۵۷
محمد سعید حکیم	میدانِ تعلیم میں ہماری بے لیسیاں	ہمدرد، 〃	اکتوبر 〃	ص ۹
محمد شفیع مرزا، پروفیسر	صنعتی تعلیم کی اسلامی اساس	شمس الاسلام، بھیرہ	دسمبر 〃	ص ۴۱

سیر و سیاحت

مصنف	عنوان	رسالہ	تاریخ	صفحہ
		دانش، اسلام آباد		ص ۱۹۳
امیر حسن عابدی، ڈاکٹر	سیاحت نامہ ساعی	دانش، اسلام آباد		ص ۱۹۳
صلاح الدین یوسف، حافظ	دورۂ برطانیہ کے مشاہدات و تاثرات (۱)	الاعتصام، لاہور	۳۰/ ستمبر ۱۹۸۸ء	ص ۱۷
〃	〃 〃 (۲)	〃 〃	۷/ اکتوبر 〃	ص ۱۵
〃	〃 〃 (۳)	〃 〃	۱۴/ 〃 〃	ص ۱۳
〃	〃 〃 (۴)	〃 〃	۲۱/ 〃 〃	ص ۱۸
〃	〃 〃 (۶)	〃 〃	۴/ نومبر 〃	ص ۱۷
〃	〃 〃 (۷)	〃 〃	۱۱/ 〃 〃	ص ۱۶
〃	〃 〃 (۸)	〃 〃	۱۸/ 〃 〃	ص ۱۶
〃	〃 〃 (۹)	〃 〃	۱۵/ 〃 〃	ص ۱۹
〃	〃 〃 (۱۰)	〃 〃	۹/ دسمبر 〃	ص ۱۶
محمد حنیف جالندھری، مولانا	بغداد سے حرمین تک (۱)	الخیر، ملتان	دسمبر 〃	ص ۲۷
مرتضیٰ، پروفیسر متین الرحمٰن	سفرنامۂ پاکستان (۳)	تکبیر، کراچی	۲۹/ ستمبر 〃	ص ۴۱
	〃 〃 (۴)	〃 〃	۱۳/ اکتوبر 〃	ص ۴۵

شخصیات

علمی و ادبی شخصیات — اقبالیات

مصنف	عنوان	رسالہ	تاریخ	صفحہ
آزاد، جگن ناتھ	علامہ اقبال کا خاندان اور آبائی گاؤں	اقبال، لاہور	جنوری، اپریل ۱۹۸۸ء	ص ۱۵
〃 〃	مغرب — اقبال کی نظر میں	اردو، کراچی	〃 〃	ص ۱۶۹

آزاد، جگن ناتھ	مغرب ـ اقبال کی نظر میں	اردو،	کراچی	جنوری	۱۹۸۸ء ص ۱۶۹
〃 〃	〃 (۲)	〃	〃	اپریل	〃 ص ۱۶۱
احمد ضیا زبیری	اقبال کی شاعری	انجمن،	〃	جولائی	〃 ص ۳۸
ادیب، عبدالکافی	علامہ اقبال کے احباب	اقبالیات،	لاہور	جنوری تا مارچ	〃 ص ۱۹۱
ادیب سہیل	غالب، اقبال، بیدل	اوراق،	〃	نومبر، دسمبر	۱۹۸۷ء ص ۵۶
اسرار احمد، ڈاکٹر	فکر اقبال کی روشنی میں	ندا،	〃	۸ر نومبر	۱۹۸۸ء ص ۳۰
اسلوب احمد انصاری	اقبال کی شاعری میں لالہ	اوراق،	〃	نومبر، دسمبر	۱۹۸۷ء ص ۳۸
اکبر رحمانی، پروفیسر	اقبال اور ملحہ حیدرآبادی	اقبالیات،	〃	جنوری تا مارچ	۱۹۸۸ء ص ۱۵۳
اکرم شاہ، ڈاکٹر سید	اقبال کا تصورِ حیات و موت	〃	〃	〃	〃 ص ۲۸۵
انور صادق، پروفیسر	اقبال کی نفسیات مذہب	اقبال،	〃	جولائی	〃 ص ۵
انور سدید، ڈاکٹر	مولانا صلاح الدین احمد اور اقبالیات	اقبالیات	〃	جنوری تا مارچ	〃 ص ۱۳۷
ایدگن ترکمن، پروفیسر	ترکی میں مطالعۂ اقبال	〃	〃	〃	〃 ص ۶۳
تحسین فراقی، ڈاکٹر	اقبال کی چند نایاب تحریریں	〃	〃	〃	〃 ص ۲۱
جہانگیر عالم، محمد	اقبال کے دو غیر مدوّن خط	اقبال،	〃	جولائی	〃 ص ۱۵۹
جیلانی کامران	دوشیزۂ مریخ اور عورت کی آزادی	〃	〃	〃	〃 ص ۱۳۹
حسن اختر ملک، ڈاکٹر	اقبال اور شاہ ولی اللہ	اقبالیات	〃	جنوری تا مارچ	〃 ص ۱۰۱
حسن رضا جعفری	اقبال اور مناظرِ قدرت	اوراق،	〃	نومبر، دسمبر	۱۹۸۷ء ص ۶۳
رفیع الدین، ڈاکٹر محمد	حکمت اقبال	حکمت قرآن،	〃	جولائی	۱۹۸۸ء ص ۵۸
〃	〃	〃	〃	اگست	〃 ص ۱۴
〃	〃	〃	〃	اکتوبر	〃 ص ۱۷
〃	〃	〃	〃	دسمبر	〃 ص ۴۱
زاہد، سید شبیر حسین شاہ	ختمِ نبوت اور اقبال	میثاق،	〃	نومبر	〃 ص ۷۳
شاہد، محمد حنیف	اقبال کا خواب اور پاکستان	تکبیر،	کراچی	۱۰ر نومبر	〃 ص ۵۶
شاہد، محمد حنیف	اقبال ـ احسان دانش کی نظر میں	اقبالیات،	لاہور	جنوری تا مارچ	〃 ص ۱۷۱
شاہین، ڈاکٹر رحیم بخش	مکتوب اقبال بنام ظفر احمد صدیقی	اقبال،	〃	جولائی	〃 ص ۱۶۵
شبلی، ڈاکٹر محمد صدیق	اقبال اور گوئٹے	〃	〃	〃	〃 ص ۱۹۳
شکیل الرحمٰن، ڈاکٹر	اقبال ـ خطیبانہ شاعری کی جمالیات	دائرے،	کراچی	نومبر	〃 ص ۳۶

صابر حسین جلیسری، ڈاکٹر	فکرِ اقبال کا ایک اہم پہلو	قومی زبان، کراچی	نومبر	۱۹۸۸ء	ص ۱۹
صابر کلوروی	مکتوبِ اقبال بنام جناح	اقبالیات، لاہور	جنوری تا مارچ	〃	ص ۷
صباح الدین عبدالرحمٰن، سید	زندہ رود	فکر و نظر، اسلام آباد	〃	〃	ص ۲۱۹
〃 〃 〃	موجودہ ہندوستان میں اقبال	〃 〃 〃	〃	〃	ص ۱۹۹
صدیق جاوید، ڈاکٹر	اقبال کا تصورِ جمہوریت	اقبال، لاہور	جولائی	〃	ص ۹۷
عبدالحمید یزدانی، خواجہ	اقبال ایرانیوں کی نظر میں	الضاف، راولپنڈی	۸ر نومبر	〃	ص ۴
〃 〃 〃	〃	〃 〃	۱۵ر 〃	〃	ص ۴
عبدالستار غوری	اقبال اور نونہالانِ ملت	فاران، کراچی	نومبر	〃	ص ۱۵
عبدالسلام خاں، مولانا محمد	اقبال کے یہاں تصوف اور عقلیت	معارف، اعظم گڑھ	ستمبر	〃	ص ۱۷۵-۱۸۲
عبداللہ قریشی، محمد	اقبال کے دوست — میاں شاہنواز	اقبال، لاہور	جولائی	〃	ص ۱۸۷
عطیہ سید، پروفیسر	علامہ اقبال اور امام غزالی	〃 〃	〃	〃	ص ۸۷
عمر حیات خاں غوری، پروفیسر	علامہ اقبال سے مولانا مودودی تک	آئین، 〃	نومبر	〃	ص ۲۷
غلام رضا سعیدی، پروفیسر	فلسفۂ اقبال کی حیات آموز ماہیت	اقبالیات، 〃	جنوری تا مارچ	〃	ص ۳۱
غلام مصطفےٰ خاں، ڈاکٹر	کلامِ اقبال	وجدان، کراچی	نومبر	〃	ص ۲۸
فریدون بدرہ ای/عبدالحمید یزدانی (مترجم)	کلامِ اقبال میں مشرق و مغرب	اقبال، لاہور	جنوری، اپریل	〃	ص ۳
مبشر الطرازی، ڈاکٹر عبداللہ	علامہ اقبال اتحادِ عالم اسلامی کے داعی	اقبالیات، 〃	جنوری تا مارچ	〃	ص ۸۷
محمد اجمل، ڈاکٹر/شہزاد احمد (مترجم)	ماورائی انسان پسندی کے امکانات اور اقبال	اقبال، لاہور	جولائی	۱۹۸۸ء	ص ۲۰۷
محمد اکرم، ڈاکٹر سید	فکرِ اقبال میں اسلامی انقلاب کے تصورات	〃 〃	〃	〃	ص ۱۲۹
محمد ریاض، ڈاکٹر	فکرِ اقبال کا ابتدائی نشوونما خیز دور	اقبالیات، 〃	جنوری تا مارچ	〃	ص ۳۴۹
محمد منور، پروفیسر	علامہ اقبال اور اصولِ حرکت	〃 〃	〃	〃	ص ۳۰۱
مظفر حسن ملک، ڈاکٹر	اقبال اور گجرات	〃 〃	〃	〃	ص ۲۱۹
محمد عبدالحق، ڈاکٹر	آفتاب (ترجمہ کاتیری)	〃 〃	〃	〃	ص ۲۰۷
نذیر نیازی مرحوم، سید	اقبال اور قرآن	حکمتِ قرآن 〃	نومبر	〃	ص ۳۹
نصر اللہ خاں، پروفیسر راجا	علامہ اقبال سے متعلق چند باتیں	لاہور، 〃	۳۱ر دسمبر	〃	ص ۶
وحید عشرت، ڈاکٹر	اقبال اور اسلام میں اصولِ حرکت	اقبال 〃	جولائی	〃	ص ۴۳

Regd. M. No. 270 Phone: 724023

Monthly **QAUMI ZABAN** Karachi

انجمن کی مجوّزہ عمارت کا نقشہ

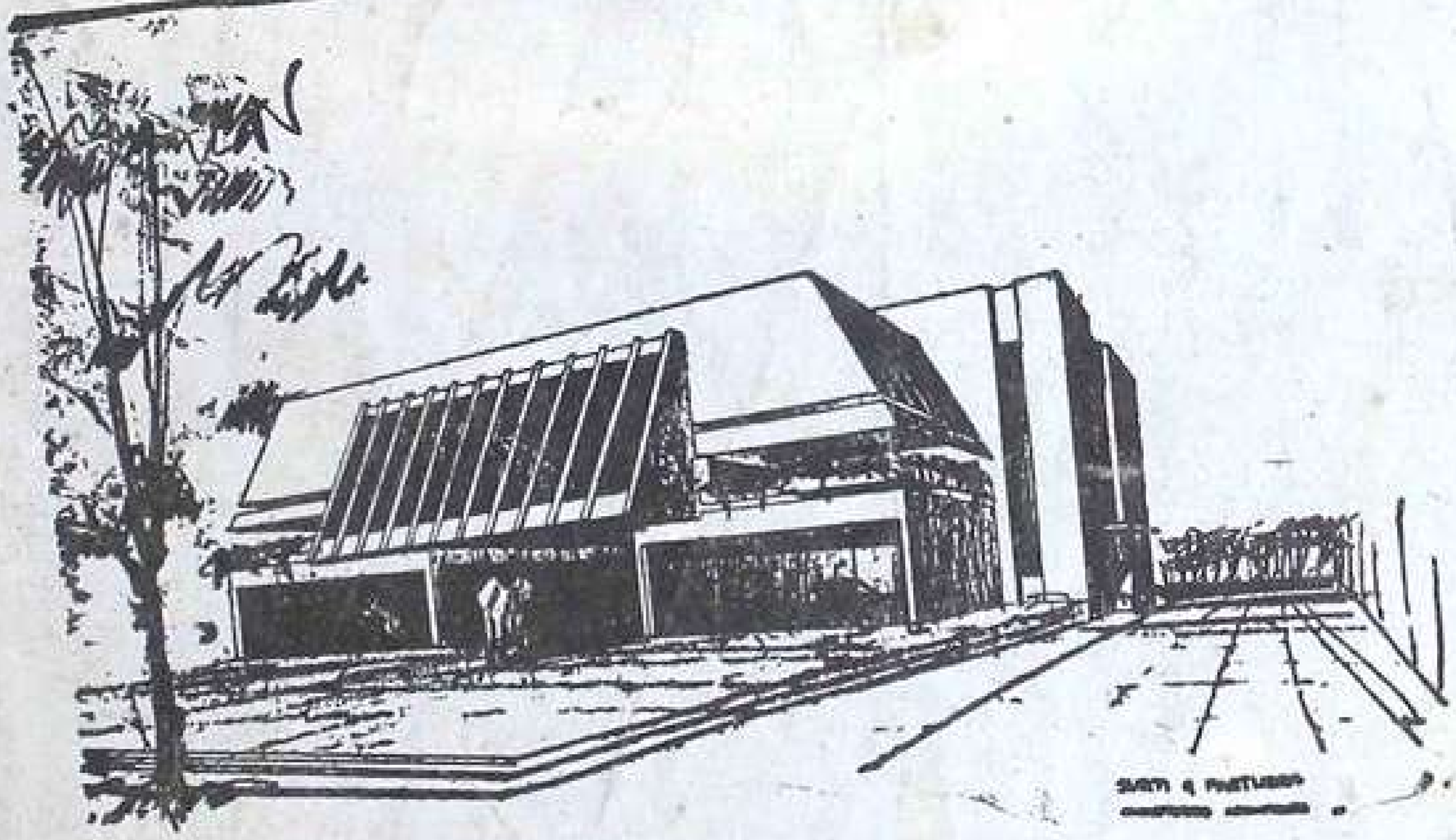

ایک خواب

جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

مدیر :- ادیب سہیل کلیم الحسن نقوی کے زیر اہتمام انجمن پریس کراچی میں چھپ کر انجمن ترقی اردو (پاکستان) - بابائے اردو روڈ - کراچی سے شائع ہوا -